سلسلہ 9

اصلاحِ عقائد

قسمت و تقدیر اور محنت و کوشش کا بیان

اِنسان اور قسمت

تالیف

حافظ مُبشّر حسین حفظہ اللہ

قرآن و حدیث اور فکر سلف کی ترجمان

مُبشّر اکیڈمی

لاہور پاکستان

ڈسٹری بیوٹر

نعمانی کتب خانہ

لاہور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقيق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتب من قبل ان نبراھا
(الحدید)

قسمت و تقدیر اور محنت و کوشش کا بیان

انسان اور قسمت

تالیف

حافظ مبشر حسین حفظہ اللہ

قرآن حدیث اور فکر سلف کی ترجمان

مبشر اکیڈمی لاہور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ''انسان اور قسمت'' ہمارے کتابی سلسلہ ''اصلاحِ عقائد'' کی نوویں کتاب ہے۔ اس سلسلہ کی گزشتہ کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی ہم نے عقیدۂ تقدیر (ایمان بالقدر) کے موضوع کو کلامی وفلسفیانہ مباحث کی پیچیدگیوں سے اجتناب کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اردو زبان پڑھنے اور سمجھنے والے ایک عام شخص کو ایمانیات کے اس رکنِ عظیم سے ممکنہ حد تک واقفیت ہو سکے اور اس کی روشنی میں وہ اپنے عقیدہ کو غلط نظریات سے بچا کر قرآن وحدیث کے مطابق بنا سکے۔

زیرِ نظر کتاب میں عقیدۂ تقدیر کے حوالے سے جبریہ وقدریہ وغیرہ فرقوں کے مقابلہ میں جمہور اہل سنت ہی کا نقطۂ نظر عام فہم اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جو شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، ان کے ازالہ وتفہیم کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک طرف احادیث کی صحت کا بھی ہم نے اسی طرح اہتمام رکھا ہے جس طرح اپنی دیگر کتابوں میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف کتاب کو عام فہم بنانے کے لیے اردو زبان کو آسان سے آسان تر رکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض جگہ روزمرہ مثالیں بھی ذکر کی ہیں۔

کتاب کے ایک باب میں تقدیر سے متعلقہ تمام اہم احادیث کو جمع کر کے ان کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی ہے اور ان احادیث سے جو شبہات بعض لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے ازالہ کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ایک باب میں تقدیر سے متعلقہ شبہات کو الگ سے پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کر کے مسئلہ کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں بعض ایسے اہل علم کی بھی کچھ تحریریں شامل کر دی گئی ہیں جنہوں نے عام فہم اسلوب میں اس مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس کتاب کو لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

(حافظ مبشر حسین)
لیکچرر ریسرچ ایسوسی ایٹ،
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی
اسلام آباد 03004602878

فہرستِ مضامین

مقدمة الكتاب

زیر نظر کتاب میں عقیدۂ تقدیر کے حوالے سے جن پہلوؤں پر بات کی گئی ہے، اس کا اختصار یہاں ہم چند نکات میں بیان کرنا چاہیں گے:

عقیدۂ تقدیر کیا ہے؟

عقیدہ وکلام کے مباحث میں اس موضوع کے لیے 'ایمان بالقدر' یا 'عقیدۂ قضاوقدر' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ قدر اور تقدیر کسی چیز کے اندازہ لگانے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے اندازہ لگانے کا عمل کسی بھی چیز کے وقوع سے پہلے ہوتا ہے اور انسانی اندازے میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا اندازہ لگایا جائے، وہ ٹھیک ٹھیک اندازے کے مطابق ہی واقع ہو، بعض اوقات اندازہ بری طرح غلط بھی ثابت ہوتا ہے مگر ظاہر ہے یہ انسانی اندازے کی بات ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کا اندازہ کبھی غلط واقع نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب قدر اور تقدیر سے اللہ کا اندازہ مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی کائنات میں ہر چیز کا اس کی تخلیق اور وقوع سے پہلے ہی ایک اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اس طرح واقع ہوگی اور چونکہ اللہ کا علم کبھی غلط نہیں ہوسکتا، اس لیے وہ چیز عین اسی طرح واقع ہو کر رہتی ہے، جس طرح اللہ کے اندازے میں تھی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں اپنے اس اندازے اور علم کو کائنات کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے اپنے پاس لوحِ محفوظ میں لکھ دیا اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اسی علم کے مطابق ہوتا ہے، یعنی اللہ کے اس علم میں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور ہمہ گیریت کو ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے بارے میں پہلے ہی علم ہے کہ کون کیا کرے گا۔ ظاہر ہے ایسا علم مخلوق میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے، بلکہ یہ خالق ہی کی شان کے لائق ہے۔

عقیدۂ تقدیر عمل کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی مزید ترغیب دلاتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے اگر پہلے ہی سے اپنے علم و اندازے کے مطابق ایک چیز لکھ دی تھی تو اس سے یہ شبہ ہرگز

نہیں ہونا چاہیے کہ ''مخلوق کو بالجبر اسی لکھے ہوئے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس لیے ہمیں تقدیر کے آگے اپنے آپ کو بے بس سمجھ کر عمل اور جدوجہد کی راہ چھوڑ دینی چاہیے''۔ حالانکہ اگر ایسے کسی جبر کا مسئلہ ہوتا تو ہمیں ضرور نظر آ جاتا، مگر ایسا کوئی جبر اور دباؤ ہم پر نہیں ہے بلکہ ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جو چاہیں عمل کریں۔ کوئی طاقت زبردستی ہمیں ہماری مرضی کے عمل سے روک نہیں دیتی۔ ہم دائیں جانا چاہیں تو کوئی طاقت زبردستی ہمیں بائیں جانب موڑ نہیں دیتی۔ ہم منہ میں نوالہ ڈالنا چاہیں تو کوئی طاقت زبردستی ہمارا ہاتھ روک نہیں لیتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ چونکہ پہلے ہی تقدیر میں سب کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں!

بعض اہل علم اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ کہ تقدیر کا لکھا ہوا تقریباً ایسے ہی ہے جیسے ایک استاد اپنے شاگردوں کا امتحان لینے سے پہلے ہی ان کے بارے میں جانتا اور ایک اندازہ رکھتا ہے کہ کون اس امتحان میں پاس ہوگا اور کون کون پاس نہیں ہو پائے گا۔ یہ اندازہ اسے اپنے شاگردوں کی پچھلی کارکردگی، ان کی ذہانت وفطانت اور عدم ذہانت وعدم محنت وغیرہ کی وجہ سے ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے اس علم واندازے کو اگر کہیں لکھ بھی دے، پھر اس کے بعد وہ ان کا امتحان لے اور امتحان کے بعد ٹھیک وہی اندازہ پورا ہو جائے کہ جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہ پاس نہ ہوگا، وہ پاس نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فلاں شاگرد اس لیے پاس نہ ہو سکا کہ استاد نے لکھ دیا تھا کہ یہ پاس نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی اس استاد کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کیا جاتا ہے کہ تم نے پہلے سے اس کے فیل ہونے کا اندازہ کیوں کر لیا تھا!!

جب مخلوق کی یہ مثال ہے کہ ایک ادنیٰ سا آدمی پیشگی اندازہ لگاتا ہے اور اس کا اندازہ اکثر وبیشتر پورا ٹھیک نکلتا ہے تو پھر خالق کے اندازے کی سمجھ آ جاتی ہے کہ اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اور خالق کو پہلے ہی سے علم ہے کہ مخلوق میں سے کون کیا کرے گا اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس نے اپنا یہ علم لکھ رکھا ہے اور اسی کا نام تقدیر ہے۔ اب کوئی انسان اس بات کو بہانہ بنا لے کہ میری تقدیر میں چونکہ فیل اور ناکام ہونا لکھا جا چکا ہے، اس لیے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ اچھے عمل کروں یا نہ کروں، تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی۔

فلسفیانہ انداز میں اس نکتے کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ''علم معلوم کے تابع ہوتا ہے نہ کہ معلوم علم کے تابع''۔

مثلاً زید اور بکر دو دوست ہیں۔ زید لاہور میں رہتا ہے اور بکر کو بھی علم ہے کہ زید لاہور میں رہتا ہے۔ زید کا

لاہور میں رہنا 'معلوم' ہے اور زید کے دوست بکر کو اس کی خبر ہونا 'علم' ہے۔ اب ظاہر ہے زید کا لاہور میں رہنا (یعنی 'معلوم') پہلے ہے یا امر واقعہ ہے اور اس واقعہ کی خبر بکر کو اس واقعہ کے بعد ہوئی ہے یعنی بکر کا 'علم' بعد میں ہے اور 'معلوم' کا تابع ہے۔ اب ایسا نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ''زید لاہور میں اس لیے رہتا ہے کہ بکر کے علم کے مطابق وہ لاہور میں رہتا ہے، اس لیے وہ مجبور ہے کہ لاہور میں رہے کیونکہ بکر کے علم نے اسے لاہور میں رہنے پر مجبور کیا ہے''۔ گویا زید کا لاہور میں رہنا (یعنی 'معلوم') بکر کے 'علم' کے تابع نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی زمینی حقائق کی بنیاد پر کوئی پیش گوئی کرتا ہے، مثلاً کوئی ڈاکٹر کسی بیمار کی بیماری سے اندازہ لگا کر اس کی موت کی پیش گوئی کر دیتا ہے اور اس کی پیش گوئی درست ثابت ہو جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اس شخص کی موت اس لیے واقع ہوئی کہ ڈاکٹر نے پیش گوئی کر دی تھی بلکہ ڈاکٹر پیش گوئی نہ بھی کرتا تو تب بھی وہ چیز واقع ہو کر رہنی تھی۔

اس سے زیادہ واضح مثال فلکیاتی پیش گوئیوں کی ہے جن میں علم ہیئت (فلکیات/Astronomy) کی بنیاد پر سائنس دان ستاروں اور سیاروں کے طلوع و غروب اور سورج و چاند گرہن وغیرہ کی پیش گوئی کرتے ہیں اور ان کی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی پیش گوئی کرنے کی وجہ سے وہ چیز واقع ہوئی ہے جس کی انہوں نے پیش گوئی کی تھی اور اگر وہ پیش گوئی نہ کرتے تو وہ چیز واقع نہ ہوتی، بلکہ وہ چیز تو ان کی پیش گوئی کے بغیر بھی واقع ہو کر رہنی تھی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو عمل کی دنیا میں اختیار اور آزادی دی ہے، اور اللہ کو پہلے ہی اپنی مخلوق کے بارے میں علم بھی ہے کہ کس شخص نے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرنا ہے اور اس کا نتیجہ اور انجام کیا ہونا ہے۔ اب اگر انسان یہ کہے کہ میں اللہ کے علم کے آگے مجبور ہوں تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق ہر انسان کے رزق، موت اور دیگر مادی چیزوں کے بارے میں سب کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے، اسی طرح اس نے اپنے علم ہی کی بنیاد پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کون کون جنت میں جائے گا اور کون کون جہنم میں۔ لیکن یہاں بھی انسان کو یہ بہانہ نہیں بنانا چاہیے کہ چونکہ اللہ نے پہلے ہی میرے مقدر میں جنتی یا جہنمی ہونا لکھ دیا ہے تو میں عمل کیوں کروں، میں تو مجبور ہوں!

یہی بہانہ انسان کسی بھی چیز کے بارے میں بنا سکتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر انسان نیکی اور برائی یا جنت اور جہنم کے مسئلہ میں صرف یہ بہانہ بناتا ہے، ورنہ رزق وغیرہ کے سلسلہ میں آپ دیکھیں گے

کہ لوگ تقدیر کا بہانہ کبھی نہیں بنائیں گے۔ کبھی آپ کو ایسا آدمی نظر نہیں آئے گا جو یہ کہہ کر گھر میں بیٹھ رہا ہو کہ میری قسمت میں روزی ہوگی تو گھر بیٹھے اور بغیر محنت کیے مجھے مل جائے گی۔ بلکہ روزی کے لیے انسان ہمیشہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور شاید بعض اوقات ضرورت سے زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے۔ ایک ماہ کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے تو ایک سال کی پلاننگ میں مصروف ہو جاتا ہے اور ایک سال کے لیے بندوبست ہو جائے تو دس سال کی سوچنے لگتا ہے، مگر جب نماز روزے اور نیک عمل کی بات آتی ہے تو دنیاوی کاموں میں دن رات محنت کرنے والے فوراً عذر پیش کرنے لگتے ہیں: جناب! قسمت میں جنت میں جانا ہوا تو چلے ہی جائیں گے......!!

دراصل یہ شیطان کا دھوکا اور نفس کا وسوسہ ہے کہ انسان اپنی آخرت کے بارے میں بالکل غلط رُخ پر سوچتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح وہ دنیا کے لیے حریص ہے اس سے کئی گنا زیادہ آخرت کے لیے حریص ہو، جس طرح دنیاوی مفادات کے لیے ہر طرح کے وسائل اور اَسباب اختیار کرتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آخرت کی بہتری کے لیے اَسباب اختیار کرے، مگر شیطان کب چاہتا ہے کہ لوگ جنت میں جائیں، اس لیے وہ انسانوں کی آخرت تباہ کرنے کے لیے اس طرح کے الٹے پلٹے عذر اور بہانے انہیں سمجھاتا رہتا ہے!

اَسباب اور جدوجہد کی اہمیت

نبی کریم ﷺ نے خود اَسباب کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور انہیں اختیار کرنے کو تقدیر کے منافی نہیں بلکہ تقدیر ہی کا حصہ قرار دیا ہے مثلاً ایسی تمام احادیث جن میں نبی کریم ﷺ نے تقدیر کے حوالے سے کوئی ایسی بات بیان کی کہ سب کچھ پہلے سے لکھا جا چکا ہے حتی کہ جہنمی اور جنتی ہونا بھی تقدیر میں لکھا جا چکا، قلم تقدیر لکھ کر خشک ہو چکا، وغیرہ وغیرہ تو اس پر صحابہ کو تردد ہوا اور انہوں نے یہ ضرور پوچھا کہ پھر ہمیں عمل کی کیا ضرورت؟!، چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا قَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ اَوْ مِنَ الْجَنَّةِ))

''تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانہ جنت یا جہنم میں لکھا جا چکا ہے''۔

تو لوگوں نے کہا:

((اَلَا نَتَّكِلُ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟))

''یارسول اللہ! پھر ہم اسی پر بھروسہ کر لیں؟'' (یعنی عمل چھوڑ دیں)

مگر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ نہیں کہا کہ ہاں عمل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ آپ نے یہی کہا کہ

((لَا، اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ)) [بخاری، کتاب القدر، ح٦٦٠٥]

''نہیں، بلکہ عمل کرو کیونکہ ہر شخص (اپنی تقدیر کے مطابق) عمل کی آسانی دیا گیا ہے''۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایسے ہی ایک سوال پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((كُلٌّ يَعْمَلُ لِمَا خُلِقَ لَهُ)) [بخاری، ایضاً، ح٦٥٩٦]

''ہر شخص وہی عمل کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے''۔

ایک اور حدیث میں ایسے ہی سوال کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ)) [ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان الله کتب کتابا لاھل الجنة واھل النار، ح ٢١٤١]

''اپنے آپ کو (شریعت اور اچھے اعمال پر) قائم دائم رکھو اور (اس طرح اللہ کا) قرب تلاش کرو کیونکہ جو جنتی ہے اس کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے (موت سے پہلے) کیسے بھی عمل کیے ہوں اور جو جہنمی ہے اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے (موت سے پہلے) کیسے بھی عمل کیے ہوں''۔

گویا اچھے عمل کرنا جنت میں جانے کا سبب اور علامت ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات بیان کی ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانے، وہ جنت میں جائے گا اور جو اس کے برخلاف کرے گا، اسے جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

اب جو کوئی نیک عمل کرتا ہے وہ گویا جنت میں جانے کا سبب اختیار کرتا ہے اور جس کی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا، اس کی تقدیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جنت میں جانے کے لیے نیک عمل کی راہ اختیار کرے گا اور نیکی ہی پر مرے گا۔ اور جس کی تقدیر میں جہنم میں جانا لکھا ہے، اس کے بارے میں یقیناً یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جہنمیوں والے عمل کرتے ہی مرے گا۔ اب اچھا یا برا عمل انسان کے اختیار میں ہے، وہ چاہے تو جنت میں جانے کے اَسباب اپنا لے اور چاہے تو جہنم میں لے جانے والے ذرائع اختیار کر لے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کی قسمت میں اگر لکھا ہے کہ وہ صاحبِ اولاد ہو گا تو ظاہر ہے اس کا سبب

بھی لکھا ہے کہ وہ شادی کرے گا اور پھر اسے اولاد کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ اگر کوئی یہ سوچ کر عمل و اَسباب کی راہ چھوڑ دے اور شادی نہ کرے کہ ہاں اگر قسمت میں اولاد ملنا مقدر ہوا تو پھر شادی نہ کر کے بھی اولاد مل کر رہے گی تو کیا اسے اولاد ملے گی؟!

ظاہر ہے ایسے شخص کو سب بے وقوف کہیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اَسباب بھی مقدر کا حصہ ہوتے ہیں مگر نجانے کیوں نیکی وعبادت کی دنیا میں آ کر ہم فوراً یہ بات بھول جاتے ہیں!!

عقیدۂ تقدیر کے بارے میں شبہات واختلافات اور اہلِ سنت کا نقطۂ نظر

اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ میں عقیدۂ تقدیر کے بارے میں شبہات واختلافات کی ایک لمبی داستان ہے۔ ہر مذہب، فلسفہ اور قوم میں مسئلہ تقدیر کے حوالے سے عجیب وغریب نظریات پائے جاتے رہے ہیں، لیکن نتیجہ اور خلاصہ کے اعتبار سے مجموعی طور پر یہ نظریات یا تو 'جبر' کے تصور پر ختم ہوتے ہیں یا پھر اس کے برعکس 'نفیِ قدر' کے تصور پر۔ جبر سے مراد یہ نظریہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنی مرضی اور آزادی سے کچھ نہیں کرتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے، پہلے سے اس کے مقدر میں اس کا کرنا لکھ دیا گیا ہے اور وہ اس مقدر (تقدیر) کے آگے مجبور ہوتا ہے۔ 'نفیِ قدر' سے مراد یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے اور کسی نظام یا پہلے سے مقدر تقدیر کے آگے وہ کسی طرح بھی مجبور نہیں ہوتا بلکہ ہر لحاظ سے پوری طرح آزاد ہوتا ہے۔ ان دو طرح کے نظریات کے پیش نظر اس مسئلہ کو 'مسئلہ جبر وقدر' بھی کہا جاتا ہے۔

مختلف اَسباب و وجوہات کے پیش نظر یہ دونوں طرح کے نظریات مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے اس مسئلہ میں جبر کا نظریہ اختیار کر لیا اور بعض نے نفیِ قدر کا۔ جنہوں نے جبر کا نظریہ اپنایا وہ 'جبریہ' اور جنہوں نے نفیِ قدر کا نظریہ اختیار کیا وہ 'قدریہ' کہلائے۔

جمہور علماءِ اہلِ سنت نے اس سلسلہ میں جبر وقدر کے بین بین (درمیانی) عقیدہ اختیار کیا اور اسے ہی انہوں نے قرآن وسنت کے مطابق قرار دیا ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک ایمان بالقدر کے چار درجات ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اہل سنت کے علماء نے مسئلہ تقدیر کو سمجھانے کے لیے اسے چار درجات میں تقسیم کر کے اس کی تفہیم وتوضیح کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اہل سنت کے نزدیک تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ درج ذیل چار چیزوں پر ایمان لایا جائے:

۱۔ اس بات پر ایمان کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

۲۔اس بات پر ایمان کہ اللہ نے ہر چیز کے بارے میں اپنا علم لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔
۳۔اس بات پر ایمان کہ اللہ کی مشیت اور قدرت ہر چیز پر محیط ہے۔
۴۔اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں جمہور اہلِ سنت ہی کا نقطۂ نظر عام فہم اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جو شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، ان کے ازالہ و تفہیم کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اگر کوئی اس مسئلہ میں مزید مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لیے درج ذیل کتابیں مفید ثابت ہوں گی:

اقوم ما قيل في المشيئة والحكمة والقضاء والقدر والتعليل، لابن تيميةؒ

الحجج العقلية والنقلية فيما ينافي الاسلام من بدع الجهمية والصوفية، لابن تيميةؒ

مسألة القدر، لابن تيميةؒ [مجموع الفتاوى، لابن تيميةؒ کے مختلف متعلقه مباحث]

شفاء العليل في مسائل القضاء والقدر والحكمة والتعليل، لابن القيم

شرح العقيدة الطحاوية، لابن ابي العز الحنفي

معارج القبول شرح سلم الوصول الى علم الاصول، للشيخ حافظ بن احمد الحكمي

القضاء والقدر في الاسلام، للدكتور فاروق دسوقي

المنية والامل، لاحمد بن المرتضى

ظهر الاسلام، وفجر الاسلام، لاحمد امين

انقاذ البشر من الجبر والقدر، للشريف المرتضى

الايمان بالقدر، للدكتور يوسف القرضاوى

القضاء والقدر، للدكتور عمر سليمان الاشقر

مسئله جبر وقدر، لسيد المودودى

الجامع الصحيح في القدر، لمقبل بن هادى الوداعى

……☆……

باب ۱

تقدیر (قضاوقدر رقسمت) اور اس پر ایمان

۱۔ تقدیر (قضاوقدر) کیا ہے؟

۲۔ تقدیر پر ایمان لانا ارکانِ ایمان میں شامل ہے

......☆......

فصل ۱

تقدیر (قضا و قدر رقسمت) کیا ہے؟

تقدیر اور قسمت کے لیے قرآن و حدیث اور عقیدہ و کلام کی کتابوں میں قضا اور قدر کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ یہ دونوں الفاظ عام طور پر ہم معنی ہی استعمال ہوتے ہیں، البتہ بعض اوقات اہل علم ان میں کچھ فرق بھی بیان کرتے ہیں۔

قدر اور تقدیر

قدر اور تقدیر کسی چیز کے اندازہ لگانے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے اندازہ لگانے کا عمل کسی بھی چیز کے وقوع سے پہلے ہوتا ہے اور انسانی اندازے میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا اندازہ لگایا جائے، وہ ٹھیک ٹھیک اندازے کے مطابق ہی واقع ہو بعض اوقات اندازہ بری طرح غلط بھی ثابت ہوتا ہے مگر ظاہر ہے یہ انسانی اندازے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اندازہ کبھی غلط واقع نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب قدر اور تقدیر سے اللہ کا اندازہ مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی کائنات میں ہر چیز کا اس کی تخلیق اور وقوع سے پہلے ہی ایک اندازہ لگالیا تھا کہ یہ اس طرح واقع ہوگی، اور چونکہ اللہ کا علم کبھی غلط نہیں ہوسکتا، اس لیے وہ چیز عین اسی طرح واقع ہوکر رہتی ہے، جس طرح اللہ کے اندازے میں تھی۔

قضا

'قضا' کا لفظ حکم دینے، فیصلہ کرنے، کسی چیز کو قولی یا عملی طور پر مکمل کر لینے یا کسی چیز کے ارادہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ تقدیر اور قسمت (یا دوسرے لفظوں میں عقیدہ و کلام) کے پس منظر میں استعمال ہو تو پھر اس کا معنی و مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر چیز کے بارے میں اس کے وقوع سے پہلے ہی یقینی اور قطعی طور پر جانتے ہیں کہ وہ کب، کیسے اور کس طرح واقع ہوگی اور پھر وہ ٹھیک اسی وقت اور اسی طرح سے واقع ہوتی ہے جس طرح سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اور اسی کا نام 'قضا' ہے کہ وہ چیز اللہ کے پیشگی اندازے اور علم کے عین مطابق واقع ہو۔

'قضاوقدر' کے بارے اہل علم کی آراء

حافظ ابن حجرؒ 'قضاوقدر' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے بارے میں اندازہ کرلیا تھا کہ وہ کس وقت اور کس طرح واقع ہوں گی، پھر اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو اپنے اسی پیشگی علم کے مطابق وجود بخشا، پس جو کچھ ہمارے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ سب اللہ کے علم، اس کی قدرت اور اس کے ارادے کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ بات دین اسلام میں قطعی اور واضح دلائل سے ثابت ہے اور سلف میں صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ اسی عقیدے پر تھے''۔ (۱)

امام سفارینی 'قضاوقدر' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''تقدیر سے مراد ہے اَبد تک واقع ہونے والی ہر وہ چیز جس کا پہلے سے علم ہے اور اسے قلم نے لکھ کر محفوظ کرلیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کا اور ہر اس چیز کا جو واقع ہوگی، ازل ہی سے اندازہ مقرر کردیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بخوبی اس بات کا علم ہے کہ فلاں چیز فلاں فلاں اَوقات میں اور فلاں فلاں صفات کے مطابق واقع ہوگی اور پھر وہ اسی اندازے (تقدیر) کے مطابق واقع ہوتی ہے''۔ (۲)

قضاوقدر میں باہمی تعلق

ابن اَثیرؒ نے قضاوقدر کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ

''یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ قدر سے مراد بنیاد ہے اور قضاء سے مراد عمارت۔ [یعنی ان دونوں میں وہ تعلق ہے جو بنیاد اور عمارت کے مابین ہوتا ہے]''۔ (۳)

حافظ ابن حجرؒ اس سلسلہ میں بعض اہل علم کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

"القضاء الحكم بالكليات على سبيل الاجمال فى الازل، والقدر الحكم بوقوع الجزئيات التى لتلك الكليات على سبيل التفصيل"

۱۔ فتح الباري، ج ۱، ص ۱۱۸۔
۲۔ عقيدة السفاريني، ج ۱، ص ۳۴۸۔
۳۔ النهاية في غريب الحديث، ج ٤ ص ۷۸۔

''قضاء سے مراد وہ کلیات ہیں جن کے بارے میں اجمالی طور پر اَزل ہی سے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے اور قدر سے مراد ان کلیات کی وہ جزئیات ہیں جو اللہ کے حکم سے تفصیل کے ساتھ [اپنے مقررہ وقت پر] ظاہر ہوتی ہیں''۔[1]

بعض اہل علم اس کے الٹ مراد لیتے ہیں یعنی ان کے بقول قدر سے مراد کلیات اور قضا سے مراد اس کی جزئیات ہیں۔[2]

قضا و قدر کے باہمی تعلق کو اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق ابتدائی خاکہ سے ہے اور دوسرے کا تعلق اس کی عملی تنفیذ سے ہے۔

بعض اہل علم کے بقول 'قضا' سے مراد اللہ تعالیٰ کا اشیاء کے بارے میں وہ اَزلی ارادہ ہے جس کے مطابق اَشیاء واقع ہوتی ہیں اور اَشیاء کا عین اسی ارادے کے مطابق واقع ہونا 'تقدیر' ہے جبکہ بعض اہل علم کے بقول 'تقدیر' سے مراد اللہ تعالیٰ کا اَشیاء کے بارے میں وہ اَزلی ارادہ ہے جس کے مطابق اَشیاء واقع ہوتی ہیں اور اَشیاء کا عین اسی ارادے کے مطابق واقع ہونا 'قضا' ہے۔

......☆......

١۔ فتح الباری، ج١١ ص١٤٩۔

٢۔ ایضاً۔

فصل ۲

تقدیر پر ایمان لانا اَرکانِ ایمان میں شامل ہے

ایمان کے چھ اَرکان ہیں

تقدیر پر ایمان لانا، ایمان کے چھ بنیادی اَرکان میں شامل ہے۔ ایمان کے پانچ ارکان کا بیان تو قرآن مجید میں یکجا ملتا ہے جب کہ چھٹے رُکن کا بیان رُکن کی حیثیت سے تو اَحادیث میں مذکور ہے، البتہ اس کے ایمانیات میں سے ہونے کی تائید کئی ایک آیات سے بھی ہوتی ہے، جنہیں ہم یہاں ذکر کریں گے۔

قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں ایمان کے پانچ ارکان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱) : ﴿ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ [البقرة : ۱۷۷]

''ساری اچھائی مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ (قرآن) پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو''۔

(۲) : ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴾

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر اس کے رسول ﷺ پر، اس کی کتاب (قرآن) پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس (قرآن) سے پہلے اس نے نازل فرمائی ہے، ایمان لاؤ! جو شخص اللہ سے، اس کے فرشتوں سے، اس کی کتابوں سے، اس کے رسولوں سے اور قیامت کے دن سے کفر کرے وہ تو بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا''۔ [سورۃ النساء:۱۳۶]

ایمان بالقدر کا بیان

اھل السنة والجماعة کے نزدیک بالاتفاق ایمان کے چھ ارکان ہیں جن میں ایک ایمان بالقدر ہے۔ اس کے ثبوت کے سلسلہ میں ذیل میں ہم قرآن وسنت کے دلائل ذکر کر رہے ہیں۔

قرآن اور ایمان بالقدر

ذیل میں وہ آیات ذکر کی جا رہی ہیں جن میں تقدیر کے بارے میں کسی نہ کسی پہلو سے ذکر ملتا ہے اور ایمان بالقدر کے عقیدہ کی تائید ہوتی ہے:

(۱)...... ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَاتَفْرَحُوْا بِمَااٰتٰكُمْ﴾ [سورة الحديد: ۲۲،۲۳]

''کوئی بھی مصیبت جو زمین میں آتی ہے یا خود تمہاری جانوں کو پہنچتی ہے، وہ ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہی کتاب میں (یعنی تقدیر میں لکھی ہوئی) ہے۔ یہ بات بلاشبہ اللہ کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ جو تمہیں نہ مل سکے اس پر تم غم نہ کرو اور جو اللہ تمہیں دے اس پر فخر نہ کرو''۔

(۲)...... ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ [سورة القمر: ۴۹]

''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے''۔

(۳)...... ﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ [سورة الاحزاب: ۳۸]

''اور اللہ تعالیٰ کے (سب) کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں''۔

(۴)...... ﴿وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾ [سورة الانفال: ۴۲]

''لیکن اللہ کو تو ایک کام کر ہی ڈالنا تھا جو مقرر ہو چکا تھا''۔

(۵)...... ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ [سورة الاعلىٰ: ۱ تا ۳]

''اپنے بہت ہی بلند رب کے نام کی پاکیزگی بیان کر، جس نے پیدا کیا اور صحیح سالم بنایا اور جس نے (ٹھیک ٹھاک) اندازہ کیا اور پھر راہ دکھائی''۔

(۶)...... ﴿وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ [سورة يونس: ۶۱]

''اور جو کام بھی تم کرتے ہو، ہمیں اس کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو۔ اور آپ

کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں ہے، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز چھوٹی اور نہ کوئی چیز بڑی مگر یہ سب ایک کھلی کتاب (یعنی تقدیر رلوح محفوظ) میں ہے"۔

(۷)...... ﴿ عٰلِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴾ [سورة سبا: ۳]

"وہ (رب) عالم الغیب ہے، اس سے ایک ذرے کے برابر کی چیز بھی پوشیدہ نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب (لوح محفوظ رتقدیر) میں موجود ہے"۔

مذکورہ بالا تمام آیات میں واضح طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا اور ہو رہا ہے، سب اللہ کے علم میں پہلے سے موجود اور اس کے پاس لکھا ہوا ہے۔

اَحادیث اور ایمان بالقدر

جن صحیح احادیث میں ایمان کے چھٹے رکن یعنی تقدیر پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے چند ایک ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱)...... ((عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ...... قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ ؟ قَالَ : اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ))

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے...... اس نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایمان کے متعلق آگاہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ایمان یہ ہے) کہ تم:

۱۔ اللہ پر ایمان لاؤ،

۲۔ اس کے فرشتوں پر ایمان لاؤ،

۳۔ اس کی (نازل کردہ) کتابوں پر ایمان لاؤ،

۴۔ اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ،

۵۔ آخرت کے دن پر ایمان لاؤ،

۶۔ اور تقدیر کے اچھا یا برا (سب اللہ کی طرف سے) ہونے پر ایمان لاؤ''۔[۱]

مذکورہ بالا چھ چیزیں ایمان کے بنیادی ارکان ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور ان ارکان میں سے ایک رکن ایمان بالقدر ہے یعنی اس بات پر ایمان لانا کہ دنیا میں انسان کے ساتھ اچھا یا برا جو کچھ پیش آتا ہے، یہ سب پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اور اللہ نے ازل ہی سے یہ سب لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اور اسی کی مشیت وقدرت سے سب کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔

(۲)...... ((عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ حَتّٰى يَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ))[۲]

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک تقدیر کے اچھا یا برا ہونے کے بارے میں ایمان نہیں لا سکتا جب تک کہ وہ یہ یقین نہ کر لے کہ جو کچھ اسے مصیبت پہنچی ہے، وہ لازماً اسے پہنچ کر رہنی تھی اور جو چیز اس تک نہیں پہنچی، وہ اس تک کسی صورت بھی نہیں پہنچ سکتی تھی''۔

(۳)...... ((عَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ: اَتَيْتُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهٗ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِّنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِيْ بِشَيْءٍ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُذْهِبَهٗ مِنْ قَلْبِيْ، قَالَ: لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمَاوَاتِهٖ وَاَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَّهُمْ مِّنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ، قَالَ: ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَ ذٰلِكَ))[۳]

۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام، ح ۸۔ ومثله فی البخاری، ح ۵۰۔

۲۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان الایمان بالقدر خیره وشره، ح ۲۱۴۴۔

۳۔ ابوداؤد، کتاب السنة، باب فی القدر، ح ۴۶۹۹، ح ۴۷۰۰۔

''ابن دیلمیؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہو گیا ہے، آپ مجھے کوئی حدیث سنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اس شبہ کو میرے دل سے نکال دے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے ان سے (حدیث بیان کرتے ہوئے) کہا: اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب دینا چاہے تو وہ انہیں عذاب دے سکتا ہے اور وہ انہیں عذاب دینے میں بالکل ظالم نہ ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ تمام (آسمان والوں اور زمین والے) لوگوں پر رحم کرنا چاہے تو اس کی رحمت ان لوگوں کے عملوں سے بہتر ہوگی۔ اور اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں صدقہ کرو تو تمہارا یہ صدقہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک کہ تم تقدیر پر ایمان نہ لے آؤ اور یہ معلوم نہ کر لو کہ جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تم سے دور نہیں ہو سکتی تھی اور جو کچھ تم سے دور ہوا ہے تم اسے پا نہیں سکتے تھے۔ اور اگر تم اس کے علاوہ کسی اور عقیدے پر فوت ہوئے تو آگ میں جاؤ گے۔ ابن دیلمی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور (ان سے اس سلسلہ میں بات کی تو) انہوں نے بھی بالکل یہی حدیث بیان کی۔ پھر میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی اسی طرح کی حدیث بیان کی۔ پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بالکل یہی حدیث مجھ سے بیان کی''۔

(٤)...... ((عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ: يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ، وَ يُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ))[1]

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے:

ا۔ اس بات پر ایمان لائے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، مجھے اللہ نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

١۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان الایمان بالقدر خیرہ وشرہ، ح ٢١٤٥۔

۲۔موت کے برحق ہونے پر ایمان لائے۔

۳۔اور موت کے بعد کی (اُخروی) زندگی کے برحق ہونے پر ایمان لائے۔

۴۔اور تقدیر پر ایمان لائے''۔

(۵)...... ((عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَاقٌّ وَلَا مُؤمِنٌ بِسِحْرٍ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ وَلَا مُكَذِّبٌ بِقَدَرٍ)) (۱)

''حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نافرمانی کرنے والا، جادو کو جائز سمجھنے والا، شراب کا رسیا اور تقدیر کو جھٹلانے والا جنت میں نہیں جائے گا''۔ (جب تک کہ اپنے گناہوں کی سزا نہ پالے)۔

(٦)...... ((عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : يَكُوْنُ فِیْ أُمَّتِیْ خَسْفٌ وَمَسْخٌ [اَوْقَذْفٌ] وَذٰلِكَ فِی الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدَرِ)) (۲)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت میں شکلوں کے بگڑنے، زمین میں دھنسنے اور پتھروں کی بارش (کے عذاب نازل) ہوں گے اور یہ ان لوگوں پر ہوں گے جو تقدیر کو جھٹلاتے ہیں''۔

(۷)...... ((عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ كَانَ : اَلزَّائِدُ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّ بِذٰلِكَ مَنْ اَذَلَّ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ اَعَزَّ اللّٰهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِیْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِیْ)) (۳)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: چھ آدمی ایسے ہیں جن پر میں لعنت کرتا ہوں اور اللہ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے ان پر لعنت کی ہے، وہ چھ یہ ہیں:

۱۔ مسند احمد، ج٦، ص ٤٤١۔

۲۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء فی الرضا بالقضاء، ح٢١٥٢، ح٢١٥٣۔ ابن ماجه، ح٤٠٦١۔ ابو داؤد، ح٤٦١٣۔

۳۔ ترمذی، ایضاً، باب عظام امر الایمان بالقدر، ح٢١٥٤۔

۱۔اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے والا۔

۲۔اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔

۳۔زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والا تاکہ اس طرح وہ اسے عزت دے سکے جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اور اسے ذلیل کر سکے جسے اللہ نے عزت دی ہے۔

۴۔اللہ کے حرام کو حلال کرنے والا۔

۵۔میری آل سے اس چیز کو حلال کرنے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔(یعنی قتل وخون ریزی)

۶۔میری سنت کو چھوڑنے والا''۔

(۸)...... ((عن عبد الواحد بن سليم قال: قدمت مكة فلقيت عطاء بن ابى رباح فقلت له يا ابا محمد! ان اهل البصرة يقولون فى القدر، قال يا بنى! اتقرأ القرآن؟ قلت: نعم، قال فاقرء الزخرف، قال فقرأت: ﴿ حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَاِنَّهُ فِيْ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ [سورة الزخرف: ۱، ٤] فقال: اتدرى ما ام الكتاب؟ قلت الله و رسوله اعلم، قال فانه كتاب الله كتبه الله قبل ان يخلق السماء وقبل ان يخلق الارض، فيه: ان فرعون من اهل النار وفيه ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ [سورة المسد: ۱]، قال عطاء: فلقيت الوليد بن عبادة بن الصامت صاحب رسول الله ﷺ فسألته: ما كانت وصية ابيك عند الموت؟ قال: دعانى فقال يا بنى! اتق الله واعلم انك لن تتقى الله حتى تؤمن بالقدر كله خيره وشره فان مت على غير ذلك دخلت النار، انى سمعت رسول الله ﷺ يقول: اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ [لَهٗ]: اُكْتُبْ، قَالَ مَا اَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ))

''عبدالواحد بن سلیمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں مکہ آیا اور وہاں عطاء بن ابی رباحؒ سے ملا اور ان سے کہا کہ اے ابو محمد! بصرہ میں کچھ لوگ تقدیر کی نفی کرتے ہیں تو حضرت عطاء نے مجھ سے کہا: بیٹا! قرآن پڑھے ہو؟ میں نے جواب دیا، ہاں۔تو وہ کہنے لگے سورۃ الزخرف پڑھو، میں نے سورۃ الزخرف کی تلاوت شروع کر دی اور ابھی اس آیت پر پہنچا تھا:

﴿ وَاِنَّهُ فِيْ اُمِّ الْكِتٰبِ...... ﴾

تو عطاء مجھ سے کہنے لگے: کیا تم جانتے ہو کہ (اس آیت میں) 'ام الکتاب' سے مراد کیا ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔ تو عطاء کہنے لگے کہ یہاں 'ام الکتاب' سے مراد وہ کتاب (یعنی تقدیر) ہے جسے اللہ نے آسمان اور زمین کی تخلیق سے پہلے لکھا تھا اور اسی کتاب (یعنی تقدیر) میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ''فرعون جہنمیوں میں سے ہے'' اور اسی کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا''۔

پھر عطاء نے مجھ (عبدالواحد) سے کہا کہ میں عبادۃ بن صامت صحابی رسول کے بیٹے ولید سے ملا اور اس سے پوچھا کہ تمہارے والد عبادہ رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت تمہیں کیا وصیت کی تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے والد نے وفات کے وقت مجھے بلایا اور کہا کہ بیٹا! اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تم اللہ سے اس وقت تک نہیں ڈر سکتے جب تک کہ تم تقدیر کے اچھا اور برا (سب اللہ کی طرف سے) ہونے پر ایمان نہ لے آؤ۔ اگر تم (تقدیر کے مسئلہ میں) اس کے علاوہ کسی اور عقیدے پر مرے تو آگ میں جاؤ گے۔ اور سنو، میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اس سے کہا: 'لکھ'۔ اس نے کہا: 'کیا لکھوں؟' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھو، جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، سب لکھ دو''۔[1]

(۹)...... ((عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ جَاءَ مُشْرِكُوْ قُرَيْشٍ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُخَاصِمُوْنَ فِي الْقَدَرِ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ [سورة القمر:۴۸،۴۹]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین قریش اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑا کیا تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں: ''جس دن وہ اپنے منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) دوزخ کی آگ لگنے کے مزے چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے''۔[2]

۱۔ ترمذی، ایضاً، باب عظام امر الایمان بالقدر، ح۲۱۵۵۔

۲۔ ترمذی، ایضاً، باب عظام امر الایمان بالقدر، ح۲۱۵۷۔

مسئلہ تقدیر میں زیادہ غور وخوض ناپسندیدہ ہے

مسئلہ تقدیر میں زیادہ غور وخوض کرنا اور بالخصوص اس مسئلہ میں ان حدود تک جا پہنچنا جو عقل سے ماوراء ہیں، ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((خَرَجَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّمَا فُقِيءَ فِي وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ؟ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِينَ تَنَازَعُوا فِي هٰذَا الْأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَلَّا تَنَازَعُوا فِيهِ))[1]

''ایک مرتبہ ہم قضاوقدر کے مسئلہ پر بحث اور جھگڑا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے (اور ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) آپ ﷺ کا چہرہ مبارک غصہ سے اس طرح سرخ ہو گیا کہ جیسے (سرخ) انار کے دانے آپ کے چہرے پر نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کیا میں اسی لیے رسول بنا کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں؟! یاد رکھو کہ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک کی گئیں کہ انہوں نے اس تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمہیں بڑی تاکید کے ساتھ اور پھر تاکید کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ تم تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ نہ کرنا''۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

''میں اور میرا بھائی ایک ایسی مجلس میں بیٹھے تھے جو ہمیں سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند تھی۔ ہوا یوں کہ میں اور میرا بھائی (نبی کریم ﷺ سے ملنے کے لیے) آئے تو ہم نے دیکھا کہ کچھ کبار صحابہ نبی کریم ﷺ کے دروازے کے پاس بیٹھے ہیں۔ ہم نے ناپسند کیا کہ ان کے درمیان جا بیٹھیں، چنانچہ ہم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ان صحابہ نے قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھی پھر اس میں ان کا جھگڑا شروع ہو گیا حتی کہ اس جھگڑے میں ان کی آوازیں بہت بلند ہو گئیں۔ ادھر نبی کریم ﷺ بھی گھر سے باہر تشریف لے

۱۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء فی التشدید فی الخوض فی القدر، ح۲۱۳۳۔ صحیح سنن الترمذی، ج۲ ص۲۲۳۔ ابن ماجه، المقدمة، باب فی القدر، ح۸۵۔

آئے، آپ غصہ میں تھے حتی کہ غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہوئے جا رہا تھا اور آپ ان پر مٹی پھینکتے ہوئے فرمانے لگے: لوگو! باز آ جاؤ، تم سے پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے نبیوں سے اختلاف شروع کر دیا اور اللہ کی کتاب کے بعض حصوں کو بعض کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا۔ بے شک قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو جھٹلاتا ہو بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے، پس تمہیں اس سے جو سمجھ آئے اس پر عمل کرو اور جس کی سمجھ نہ آئے وہ اس کتاب کے عالم کی طرف لوٹا دو''۔ (۱)

ان حدیثوں میں مسئلہ تقدیر کے حوالے سے جس چیز کو قابلِ مذمت قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور مسئلہ تقدیر کے بعض پہلو یقیناً انسانی عقل وفہم سے بالا ہیں، لہٰذا انسان کو اس مسئلہ کے ان پہلوؤں کے بارے میں سوچ وبچار اور بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہیے جو اس کی عقل سے ماوراء ہیں۔ بالخصوص تقدیر سے متعلقہ قرآن وسنت کے وہ نصوص (متون ر دلائل) جو انسان کی سمجھ سے بالا ہوں، یا جن سے قرآن وحدیث کے بارے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہوں، وہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان کی حقانیت کے سامنے انسان اپنے فہم کی تقصیر وکوتاہی کو تسلیم کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دے۔

۱۔ مسند احمد، ح۶۷۰۳۔ شیخ احمد شاکرؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ورواہ مسلم مختصراً۔

باب۲

عقیدۂ تقدیر اور جمہور اہلِ سنت کا نقطۂ نظر

جمہور اہلِ سنت کے نزدیک ایمان بالقدر کے چار درجات ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اہل سنت کے علماء نے مسئلہ تقدیر کو سمجھانے کے لیے اسے چار درجات میں تقسیم کر کے اس کی تفہیم و توضیح کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اہل سنت کے نزدیک تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ درج ذیل چار چیزوں پر ایمان لایا جائے:

۱۔اس بات پر ایمان کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

۲۔اس بات پر ایمان کہ اللہ نے ہر چیز کے بارے میں اپنا علم لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔

۳۔اس بات پر ایمان کہ اللہ کی مشیت اور قدرت ہر چیز پر محیط ہے۔

۴۔اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی چار چیزوں کو بالتفصیل بیان کریں گے۔

......☆......

فصل ۱

اس بات پر ایمان کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت علیم بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے بارے میں اس طرح جانتے اور علم رکھتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اور اس طرح کا علم نہیں رکھتا۔ یہ علم کیسا ہے، اس کے بارے میں قرآن وسنت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی حرکت نہیں ہوتی جس کا علم اللہ کو نہ ہو۔ جس طرح اللہ کو ماضی اور حال کا علم ہے، اسی طرح مستقبل کا بھی علم ہے۔ ہر چیز کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اللہ کو اس کے بارے میں ہر طرح کا علم تھا۔ اللہ کی کائنات میں کوئی پتہ اور ذرہ ایسا نہیں جس کے بارے میں اللہ کو علم نہ ہو۔ ذیل میں چند ایک وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں اللہ کے اس وسیع وعریض اور ہمہ گیر علم کے بارے میں معلومات ملتی ہیں:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱)...... ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ [سورة الحشر : ۲۲]

''اللہ تعالیٰ ہی ایسی ذات ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور وہ ظاہر و باطن (سب) سے آگاہ ہے''۔

یعنی اللہ کو ہر ظاہر اور مخفی چیز کے بارے میں علم ہے، گویا اللہ کے نزدیک کوئی مخفی سے مخفی چیز بھی پوشیدہ اور اوجھل نہیں ہے۔ اگلی آیت میں بھی یہی چیز اس طرح بیان کی گئی ہے:

(۲)...... ﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ﴾ [سورة النمل : ٦٥]

''آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ (لوگ) تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے؟''

(۳)...... ﴿وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ [سورة الاسراء : ۸۵]

''اور تمہیں نہایت قلیل علم دیا گیا ہے''۔

یعنی اصل علم اللہ کے پاس ہے اور مخلوق کو نہایت قلیل علم دیا گیا ہے، جب ہم مخلوق کے علم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں کس حد تک ترقی کر گئی ہے تو فوراً اللہ کے علم کی طرف توجہ جاتی ہے کہ اگر مخلوق کا یہ علم اللہ کے مقابلہ میں نہایت قلیل ہے تو پھر اللہ کا علم کتنا وسیع ہوگا!

(٤)...... ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ [سورة الطلاق: ١٢]

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اسی کے مثل زمینیں بھی۔ اس کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبارِ علم گھیر رکھا ہے''۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز بھی اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ ظاہر ہے مخلوق میں سے کوئی بھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(٥)...... ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ [سورة النحل: ١٢٥]

''یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی تخلیق سے پہلے ہی یہ معلوم تھا کہ ان میں سے گمراہی کی راہ اختیار کرنے والے کون ہیں اور ہدایت پانے والے کون ہیں۔

(٦)...... ﴿عٰلِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ [سورة سبا: ٣]

''وہ (رب) عالم الغیب ہے، اس سے ایک ذرے کے برابر کی چیز بھی پوشیدہ نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے''۔

(٧)...... ﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ [سورة النجم: ٣٢]

''بے شک تیرا رب بہت کشادہ مغفرت والا ہے اور وہ تمہیں بخوبی جانتا ہے (اس وقت سے) جب کہ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے، پس تم اپنی پاکیزگی بیان

نہ کرو، وہی پرہیزگار کو خوب جانتا ہے''۔

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کے وسعت کا بیان ہے۔ احادیث میں بھی اللہ کے ہمہ گیر اور وسیع علم کے حوالے سے کئی باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ عَنْ اَوْلَادِ الْمُشْرِکِیْنَ فَقَالَ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ))[1]

''نبی کریم ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا (کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ (بڑے ہوکر) کیا عمل کرتے''۔

سوال کا مطلب یہ تھا کہ بچپن میں فوت ہونے والوں نے تو کوئی بھی اچھا یا برا عمل نہیں کیا، اب انہیں جنت یا جہنم کہاں جگہ دی جائے گی۔ اگر تو انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا جائے گا جب کہ ان کا کوئی برا عمل نہیں اور اگر جنت میں جگہ دی جائے تو تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغیر کسی اچھے عمل کے انہیں جنت کیوں ملے گی۔

نبی کریم ﷺ نے واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ اللہ کے علم میں پہلے ہی سے تھا کہ اگر یہ بڑے ہوتے تو کس طرح کے عمل کرتے، لہٰذا انہیں اپنے اسی علم کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ جنت یا جہنم، جہاں چاہیں گے، جگہ دیں گے۔ یہی علم اللہ تعالیٰ کو زندہ لوگوں کے بارے میں بھی ہے کہ وہ عمر بھر کون سے عمل کریں گے، انہیں موت کس عمل پر آئے گی اور پھر ان کا انجام کار کیا ہوگا۔

ظاہر ہے اللہ کے اس پیشگی علم کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے آپ کو تقدیر اور علم الٰہی کے مقابلہ میں مجبور سمجھے اور یہ فرض کر لے کہ وہ اپنی آزادی اور خودمختاری سے کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان یہ سوچ کر عمل کی راہ چھوڑ دے کہ میرے بارے میں اللہ کو پہلے سے علم ہے کہ میں نے جنت میں جانا ہے یا جہنم میں، لہٰذا مجھے عمل کی کیا ضرورت۔ ان شبہات کی توضیح تفصیل کے ساتھ آگے آئے گی۔

......☆......

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب اللہ اعلم بما کانوا عاملین، ح۶۵۹۷۔

فصل ۲

اس بات پر ایمان کہ اللہ نے ہر چیز کے بارے میں اپنا علم لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے

قرآن مجید کی بہت سی آیات اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات میں ہونے والی ہر چیز کا پہلے سے علم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں اپنا علم لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اسی علم کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کے اس علم میں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں:

آیات

(۱)...... ﴿وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ﴾ [سورة الطور: ۱ تا ۳]

''قسم ہے طور کی۔ اور لکھی ہوئی کتاب کی، جو جھلی کے کھلے ہوئے ورق میں ہے''۔

طور سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ اللہ سے ہم کلام ہوئے تھے اور لکھی ہوئی کتاب سے مراد بعض مفسرین کے بقول لوحِ محفوظ ہے جس میں ہر چیز کی تقدیر لکھی ہے۔

(۲)...... ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾ [سورة الحج: ۷۰]

''کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی ہوئی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے''۔

(۳)...... ﴿وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ [سورة یونس: ۶۱]

''اور جو کام بھی تم کرتے ہو، ہمیں اس کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو۔ اور آپ

کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں ہے، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز چھوٹی اور نہ کوئی چیز بڑی مگر یہ سب واضح کتاب میں (لکھا ہوا) ہے''۔

(٤)...... ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ [سورة فاطر:١١]

''لوگو! اللہ نے تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے، پھر تمہیں جوڑے جوڑے (مرد وعورت) بنا دیا ہے۔ عورتوں کا حاملہ ہونا اور بچوں کا تولد ہونا سب اس کے علم ہی سے ہے اور جو بڑی عمر والا عمر دیا جائے اور جس کسی کی عمر گھٹے وہ سب کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر یہ بات بالکل آسان ہے''۔

(٥)...... ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ آثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ [سورة يٰسٓ:١٢]

''بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے۔ اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو وہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں ضبط کر رکھا ہے''۔

(٦)...... ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ [سورة البروج:٢١، ٢٢]

''بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا، لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)''۔

(٧)...... ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ﴾ [سورة الحديد: ٢٢، ٢٣]

''کوئی بھی مصیبت جو زمین میں آتی ہے یا خود تمہاری جانوں کو پہنچتی ہے، وہ ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہی کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ یہ بات بلاشبہ اللہ کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ جو تمہیں نہ مل سکے اس پر تم غم نہ کرو اور جو اللہ تمہیں دے اس پر فخر نہ کرو''۔

أحادیث

اس مسئلہ میں کئی ایک احادیث بھی مروی ہیں جو آئندہ فصل میں تفصیل کے ساتھ ذکر کی جائیں گی، یہاں چند ایک احادیث کا صرف ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سب سے پہلے اللہ ہی کا وجود تھا اور کسی چیز کا وجود نہیں تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا اور اس نے لوحِ محفوظ میں ہر چیز کو لکھا، پھر آسمان اور زمین کی تخلیق فرمائی''۔[۱]

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو اپنی اس کتاب جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، (یعنی لوح محفوظ) میں لکھا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔[۲]

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ انہیں میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں والے کام کریں گے۔ پھر کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ انہیں میں نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جہنمیوں والے کام کریں گے۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! پھر کوئی عمل کرنے کی کیا ضرورت؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جنت کے لیے پیدا فرمائیں تو پھر اس سے وہی عمل کرواتے ہیں جو جنتیوں والے عمل ہوں حتی کہ اسی حالت میں وہ فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ جہنم کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے وہی عمل کرواتے ہیں جو اہل جہنم کے ہوں اور وہ اہل جہنم کے عمل ہی پر مرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ڈال دیتے ہیں''۔[۳]

۴۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في قول الله تعالى: وهو الذي يبدأ الخلق ثم يعيده، ح ۳۱۹۱۔

۲۔ بخاری، ایضاً، ح ۳۱۹٤۔ مسلم، کتاب التوبة، باب في سعة رحمة الله، ح ۲۷۵۱۔

۳۔ موطا، ج ۲ ص ۸۹۸۔ احمد، ج ۱ ص ٤٤۔ حاکم، ج ۱ ص ۲۷۔ ابن حبان، ح ٦١٦٦۔ ابو داؤد، کتاب السنة، باب في سورة الاعراف، ح ٤۷۰۳۔ شیخ البانیؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا۔ دیکھیے: مشکاة بتحقيق الثاني، ۹٦۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب پیدا فرمالیا تو ان کے دائیں کندھے پر ضرب لگائی اور سفید اولاد نکالی (وہ اس طرح تھی کہ) گویا چیونٹیاں ہیں پھر بائیں کندھے پر ضرب لگائی اور سیاہ اولاد نکالی، گویا کہ وہ کوئلے ہیں۔ دائیں کندھے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں، پھر بائیں کندھے والوں کے لیے فرمایا کہ یہ جہنمی ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں''۔[1]

۵۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا:

''اے عائشہ! اللہ نے جنت کے لیے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے حق میں اس وقت ہی جنتی ہونا لکھ دیا تھا کہ جب ابھی وہ اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے اور جہنم کے لیے بھی لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے حق میں جہنمی ہونا اس وقت ہی لکھ دیا تھا کہ جب ابھی وہ اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے''۔[2]

مطلب یہ کہ اللہ نے اپنے علم کی بنیاد پر لوگوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے جنتی یا جہنمی ہونے کا لکھ دیا تھا۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

''ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (گھر سے) باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے کہا نہیں اللہ کے رسول، مگر یہ کہ آپ ہمیں اس بارے میں بتائیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا: یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جنت اور ان کے آباؤ اجداد اور قبائل وخاندان کے نام درج ہیں۔ اسے اہل جنت کے ناموں کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں کتاب کے بارے میں فرمایا کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور اس میں اہل دوزخ کے نام ہیں اور ان کے آباؤ اجداد اور کنبوں قبیلوں کے نام ہیں۔ اسے بھی بند کر دیا گیا ہے اور اس میں اب کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! اگر یہ سب پہلے ہی لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت اور جواز ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے آپ کو (شریعت اور اچھے اعمال

۱۔ مسند احمد، ج۶ص ۴۴۱۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: السلسلة الصحيحة، ۴۹۔

۲۔ مسلم، کتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، ح۲۶۶۲۔

پر) قائم دائم رکھو اور (اس طرح اللہ کا) قرب تلاش کرو کیونکہ جو جنتی ہے اس کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیے ہوں اور جو جہنمی ہے اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیے ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کتابوں کو رکھ دیا یعنی پیچھے ڈال دیا اور فرمایا: تمہارا پروردگار یہ لکھ کر فارغ ہو چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت جہنمی ہے''۔ (۱)

ایک شبہ کا ازالہ

اللہ تعالیٰ نے اگر پہلے ہی سے اپنے علم و اندازے کے مطابق ایک چیز لکھ دی تھی تو اس سے یہ شبہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ مخلوق کو بالجبر اسی لکھے ہوئے پر مجبور کیا جاتا ہے، اگر ایسے کسی جبر کا مسئلہ ہوتا تو ہمیں ضرور نظر آ جاتا۔ مگر ایسا کوئی جبر اور دباؤ ہم پر نہیں ہے بلکہ ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جو چاہیں عمل کریں۔ کوئی طاقت زبردستی ہمیں ہماری مرضی کے عمل سے روک نہیں دیتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ چونکہ پہلے ہی تقدیر میں سب کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں!

بعض اہل علم اسے ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ کہ تقدیر کا لکھا ہوا تقریباً ایسے ہی ہے جیسے ایک استاد اپنے شاگردوں کا امتحان لینے سے پہلے ہی ان کے بارے میں جانتا اور ایک اندازہ رکھتا ہے کہ کون اس امتحان میں پاس ہوگا اور کون کون پاس نہیں ہو پائے گا۔ یہ اندازہ اسے اپنے شاگردوں کی پچھلی کارکردگی، ان کی ذہانت و فطانت اور عدم ذہانت و عدم محنت وغیرہ کی وجہ سے ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے اس علم و اندازے کو اگر کہیں لکھ بھی دے، پھر اس کے بعد وہ ان کا امتحان لے اور امتحان کے بعد ٹھیک وہی اندازہ پورا ہو جائے کہ جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہ پاس نہ ہوگا، وہ پاس نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فلاں شاگرد اس لیے پاس نہ ہو سکا کہ استاد نے لکھ دیا تھا کہ یہ پاس نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی اس استاد کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کیا جاتا ہے کہ تم نے پہلے سے اس کے فیل ہونے کا اندازہ کیوں کر لیا تھا!!

جب مخلوق کی یہ مثال ہے کہ ایک ادنیٰ سا آدمی پیشگی اندازہ لگاتا ہے اور اس کا اندازہ اکثر و بیشتر پورا ٹھیک نکلتا ہے تو پھر خالق کے اندازے کی سمجھ آ جاتی ہے کہ اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں نکل سکتا۔ اور خالق کو پہلے ہی

۱۔ ترمذی، التفسیر، باب ما جاء ان اللہ کتب کتابا لاھل الجنة...، ح ۲۱۴۱۔ صحیح ترمذی، ج ۲، ص ۲۲۵۔

سے علم ہے کہ مخلوق میں سے کون کیا کرے گا اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس نے اپنا یہ علم لکھ رکھا ہے اور اسی کا نام تقدیر ہے۔ اب کوئی انسان اس بات کو بہانہ بنا لے کہ میری تقدیر میں چونکہ فیل اور ناکام ہونا لکھا جا چکا ہے، اس لیے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا خواہ اچھے عمل کروں یا نہ کروں، تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی۔

لکھی گئی تقدیر پانچ قسم کی ہے

قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تقدیر لکھی جا چکی ہے، وہ پانچ طرح کی ہے:

۱۔ ایک وہ جو آسمان وزمین اور کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ نے لکھ دی تھی۔ اسے 'تقدیر اَزلی' کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسری وہ جو روحوں کو پیدا کر کے ان سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا عہد لینے کے موقع پر لکھی گئی۔ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جب اللہ نے اَرواح کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں تو سب اَرواح نے کہا ہاں، کیوں نہیں! (مگر دنیا میں آنے کے بعد بعض نے اللہ کو رب مانا اور بعض نے انکار کیا)

۳۔ تیسری وہ جو ماں کے پیٹ میں روح پھونکے جانے کے وقت فرشتہ اللہ کے حکم سے لکھتا ہے۔ اسے 'تقدیر عمری' (عمر بھر کی تقدیر) کہا جاتا ہے۔

۴۔ چوتھی وہ جو 'لیلۃ القدر' کے موقع پر ہر سال لکھی جاتی ہے۔ اسے 'تقدیر حولی' (سالانہ تقدیر) کہا جاتا ہے۔

۵۔ پانچویں وہ جو روزانہ لکھی جاتی ہے۔ اسے 'تقدیر یومی' کہا جاتا ہے۔

یہ پانچوں طرح کی تقدیر ایک دوسرے کے منافی اور متعارض نہیں ہے، مثلاً جو تقدیر کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی لکھی جا چکی ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ ہر انسان میں روح پھونکے جانے کے موقع پر فرشتے کو حکم دیتے ہیں کہ اس کی عمر بھر کی تقدیر اپنے پاس لکھ لو۔ پھر اسی تقدیر سے لیلۃ القدر کے موقع پر سال بھر کا ریکارڈ دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح یومی تقدیر بھی اسی ازلی تقدیر کے اجراء ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یومی تقدیر تفصیل ہے حولی تقدیر کی، حولی تقدیر تفصیل ہے عمری تقدیر کی، عمری تقدیر تفصیل ہے عہد الست کے موقع والی تقدیر کی اور یہ تفصیل ہے تقدیر اَزلی کی۔[1]

۱۔ اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے: شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل، از حافظ ابن القیمؒ، ص ۲۷ تا ۵۹۔ معارج القبول شرح سلم الوصول الی علم الاصول، از: حافظ بن احمد الحکمی، ص ۷۸۰ تا ۷۹۴۔

فصل۳

اس بات پر ایمان کہ اللہ کی مشیت اور قدرت ہر چیز پر محیط ہے

مسئلہ تقدیر پر ایمان کے حوالے سے تیسری چیز یہ ہے کہ ایک مسلمان کا اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کی مشیت اور قدرت سے ہوتا ہے اور جو کچھ نہیں ہوتا، اس کے پیچھے بھی اللہ کی مشیت ہوتی ہے اور اس کے واقع نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کام پر قدرت نہیں تھی، معاذ اللہ! ، بلکہ اللہ تعالیٰ کو ہر کام پر قدرت کاملہ حاصل ہے، تاہم بہت سے کاموں کے وقوع یا عدم وقوع کے پیچھے اس کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ آئندہ سطور میں اس نکتے پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

مشیت، قدرت اور رضا میں فرق

اس بحث میں تین اصطلاحات استعمال ہوں گی یعنی مشیت، قدرت اور رضا۔ اوران تینوں کا اردو مفہوم سمجھنا ضروری ہے، ورنہ اسے نہ سمجھنے سے کئی ایک شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔

مشیت اور اس کی قسمیں

لفظ مشیت عربی زبان میں عام طور پر 'ارادے' کے مفہوم میں اور بعض اوقات اذن اور اجازت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مشیت دو طرح کی ہے: ایک کو مشیت کونیہ اور دوسری کو مشیت شرعیہ کہا جاتا ہے۔ اگر مشیت کی جگہ لفظ ارادہ استعمال کریں تو پھر اس طرح کہیں گے کہ یہ ارادہ دو طرح کا ہے: ایک 'ارادہ کونیہ' (اسے ارادہ قدریہ خلقیہ بھی کہا جاتا ہے) اور دوسرا 'ارادہ شرعیہ' ہے۔

ا۔ ارادہ کونیہ یا مشیت کونیہ

ارادہ کونیہ یا مشیت کونیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے اللہ کا ارادہ کونیہ یا مشیت کونیہ کارفرما ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی مشیت کے بغیر اس کائنات میں ایک پتہ بھی حرکت نہیں

کرتا۔ سورج، چاند، ستارے، ارض وسما سب اللہ کے ارادے کے ماتحت حرکت کر رہے ہیں۔ بارش کا نزول، ہواؤں اور بادلوں کا چلنا، رات دن کا بدلنا، یہ سب کچھ جو اس کائنات میں ہو رہا ہے، اللہ کے ارادے اور اجازت کے تحت ہو رہا ہے اور اگر کوئی کام اللہ کی رضا اور پسند کے خلاف ہو رہا ہے مثلاً اللہ کے ساتھ کفر و شرک، بغاوت و سرکشی وغیرہ تو اس میں بھی اللہ کی حکمت پوشیدہ ہے۔

مشیت، چاہت اور رضا

مشیت کا لفظ اگرچہ چاہت اور رضا کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر یہاں ہم اس کا یہ مفہوم مراد نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ ارادہ کونیہ یا مشیت کونیہ کے تحت اللہ تعالیٰ نے بہت سے ایسے کاموں کو بھی کائنات میں ہونے دیا ہے جو اللہ کی رضا، پسند اور چاہت کے خلاف ہیں مثلاً شیطان اور شر کا وجود اللہ کی پسند اور مرضی کا تقاضا نہیں مگر اس کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ تھا کہ شیطان اور شر بھی دنیا میں موجود رہیں تاکہ انسانوں کا امتحان صحیح طرح لیا جا سکے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ﴾

"لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے اور کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمہاری نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے"۔ [سورۃ الحجرات: ۷]

مطلب یہ کہ اللہ کی چاہت بھی یہی ہے کہ لوگ ایمان کی راہ اختیار کریں اور کفر و فسق کو ناپسند کریں، خود اللہ کے ہاں بھی یہ چیزیں ناپسندیدہ ہیں مگر اس کے باوجود یہ چیزیں دنیا میں موجود ہیں اور ان کی موجودگی کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کو ان کے خاتمے پر معاذ اللہ قدرت اور طاقت حاصل نہیں بلکہ ان کی موجودگی اس کی حکمت کے تحت ہے اور اس نے اپنی مشیت سے ان چیزوں کو وجود بخشا ہے۔

۲۔ ارادہ شرعیہ یا مشیت شرعیہ

ارادہ شرعیہ یا مشیت شرعیہ سے مراد اللہ کی مرضی، پسند اور چاہت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ چاہے تو خیر کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو شر اور کفر کی۔ مگر اللہ کی مشیت شرعیہ یا دوسرے لفظوں میں اللہ کی پسند، مرضی اور چاہت اس میں ہے کہ انسان اللہ کا شکر گزار اور فرمانبردار بن کر خیر کی راہ اختیار کرے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ نے اسی بات کا حکم دیا ہے کہ انسان خیر اور دین کی راہ اختیار کرے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ [سورة النساء: ٢٦ تا ٢٨]

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے خوب کھول کر بیان کر دے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تم پر رجوع کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور ہٹ جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے تخفیف کر دے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔

مشیت اور قدرت وطاقت

اللہ کی قدرت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں موجود ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کو ملکیتِ تامہ اور قدرتِ مطلقہ حاصل ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [سورة البقرة: ٢٠]

''اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

دنیا میں اگر کفر، شرک، بدعات وخرافات اور شر موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تو انہیں موجود نہیں رکھنا چاہتا مگر اللہ کی طاقت کے برخلاف یہ چیزیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ بلکہ اللہ چاہے تو انہیں فوراً ختم کر سکتا ہے مگر اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ایک محدود وقت تک کے لیے موجود رہیں۔ اسے آپ اس مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسے آدمی کو مصیبت یا مشکل آتی ہے جو بڑا متقی اور نیک صالح ہوتا ہے۔ اب اللہ چاہیں تو اپنے ایسے بندے کو کسی مصیبت میں مبتلا ہی نہ ہونے دیں مگر اللہ تعالیٰ اس کے باوجود نیک لوگوں کو مصائب ومشکلات میں ڈالتے ہیں اور اس میں اللہ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اس طرح ان لوگوں کے ایمان کا امتحان لیا جائے یا ان مصائب ومشکلات کے بدلے میں ان کے گناہ دنیا ہی میں معاف کر دیئے جائیں یا ان کے درجات بلند کیے جائیں۔

اسی طرح اللہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنایا جائے، اس لیے لوگوں کو اپنی حکمت کے تحت اللہ نے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ چاہیں تو ایمان کی راہ اختیار کریں اور چاہیں تو کفر وسرکشی پر کمربستہ ہو رہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [سورة الدهر: ۲، ۳]

''بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لیے پیدا کیا اور اس کو دیکھتا سنتا بنایا۔ ہم نے اسے سیدھی راہ دکھادی اب چاہے تو شکر کرنے والا بن جائے یا کفر کرنے والا''۔

اللہ کی مشیت، قدرت اور انسانی اختیار

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے پیچھے اللہ کی مشیت اور قدرت ضرور شامل ہوتی ہے، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ کے اذن اور مشیت کے بغیر دنیا میں کوئی کام واقع ہو۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت کو چیلنج کرنے والی بات ہو اور اس کا مطلب یہ ہو کہ دنیا میں کوئی اور بھی ایسی طاقت ہے جو اللہ کی مشیت کے خلاف عمل کرتی ہے اور اللہ کی قدرت وہاں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ معاذ اللہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جہاں تک انسان کے اختیار کی بات ہے تو اس سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ اللہ ہی نے اپنی مخلوقات میں سے انسان کو کچھ اختیار دیا ہے۔ وہ اختیار یہ ہے کہ انسان کو عمل میں آزادی دی گئی ہے کہ چاہے تو اچھا عمل کرے اور چاہے تو برا۔ نہ اچھا عمل کرنے میں فرشتوں کی طرح وہ مجبور ہے اور نہ ہی برا عمل کرنے میں اسے مجبور بنایا گیا ہے۔

اللہ کی مشیت اور بندے کی مشیت

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اللہ کی مشیت ہے اور دوسری بندے (یا مخلوق) کی مشیت۔ بندے کو جو مشیت ملی ہے وہ دراصل اللہ ہی کی طرف سے ملی ہے۔ اس لیے اللہ کی مشیت اصل ہے اور بندے کی مشیت فرع۔ اللہ کی مشیت خالق کی مشیت ہے اور بندے کی مشیت مخلوق کی مشیت۔ اللہ کی مشیت کامل ومطلق ہے اور بندے کی مشیت محدود اور مقید۔ اور ظاہر ہے جہاں اللہ کی مشیت اور بندے کی مشیت کا ٹکراؤ ہوگا، وہاں اللہ کی مشیت بندے کی مشیت پر غالب ہوگی، بندے کی مشیت اللہ کی مشیت پر کبھی غالب نہیں ہوسکتی۔

اس سلسلہ کی آیات

اللہ کی مشیت اور بندے کی مشیت واختیار کے سلسلہ میں تین طرح کی آیات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ایک تو وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی مشیتِ مطلقہ کے بارے میں بیان ہوا ہے اور ان کے مطالعہ سے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ کی مشیئت کے آگے ساری مخلوق مجبور ہے۔ اور جن لوگوں نے تقدیر کے سلسلہ میں 'جبر' (یعنی انسان تقدیر کے آگے مجبور محض ہے) کا نظریہ اختیار کیا، وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں اسی قسم کی آیات سے استدلال کرتے ہیں اور ان کے علاوہ باقی دو قسم کی آیات سے یا تو صاف نظر پھیر لیتے ہیں یا پھر ان کی اس انداز سے تاویل کی کوشش کرتے ہیں کہ جس سے ان کے نقطہ نظر کی تردید لازم نہ آئے۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن میں بندے کی مشیئت اور اختیار و آزادی کا ذکر ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید بندہ اپنی تقدیر بنانے میں کلی طور پر خود مختار ہے اور جن لوگوں نے تقدیر کے سلسلہ میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ انسان اپنے افعال کا خالق خود ہی ہے اور اپنی تقدیر بھی وہ خود بناتا ہے اور تقدیر کا پہلے سے لکھا ہوا ہونے کا تصور غلط ہے۔ ان لوگوں نے اسی قسم کی آیات سے اپنے نقطہ نظر پر استدلال کیا ہے اور دیگر آیات کی تاویل کی کوششیں کی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیئت اور بندے کی مشیئت کا ٹکراؤ ہو تو اللہ کی مشیئت ہی غالب رہتی ہے۔

ان تین طرح کی آیات کو اگر الگ الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے ظاہر ہے ان تمام طرح کی آیات کو ملا کر ہی ان کے صحیح فہم تک رسائی ممکن ہے۔

وہ آیات جن میں اللہ کی مشیئتِ مطلقہ کے بارے میں بیان ہوا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱)...... ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ [سورۃ الدھر: ۲۹، ۳۰]

''اور تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا ہے''۔

(۲)...... ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ [سورۃ التکویر: ۲۷ تا ۲۹]

''یہ تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت نامہ ہے، (بالخصوص) اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے''۔

(۳)...... ﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [سورة يس: ۸۲،۸۳]

''وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اتنا ہی فرماتا ہے کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ پس وہ اللہ پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے''۔

(٤)...... ﴿ مَنْ يَّشَإِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَأْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے راہ کر دے اور وہ جس کو چاہے سیدھی راہ پر لگا دے''۔ [سورۃ الانعام ۳۹]

بعض لوگ یہاں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اللہ کی مشیت مطلقہ کے تحت یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کفر یا فسق و فجور سب کچھ اللہ کی مشیت ہی سے ہے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ اللہ کی مشیت اور قدرت کے آگے ہم ہر لحاظ سے مجبور ہیں۔ حالانکہ بات یہ نہیں کہ اللہ کی مشیت کے آگے انسان اس طرح سے مجبور ہے کہ اسے عمل کی آزادی اور اختیار کی قوت سرے سے حاصل ہی نہیں، بلکہ انسان کو بھی اللہ نے ارادے اور قوت کی طاقت اور ایک دائرے کے اندر ایک حد تک عمل کی آزادی دے رکھی ہے اور انسان اس آزادی کی بنیاد پر اچھا یا برا جو چاہے کرنے میں آزاد بنایا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ایسی آیات ذکر کر رہے ہیں جن سے انسان کی مشیت اور اختیار و آزادی کا واضح طور پر ذکر ملتا ہے۔

وہ آیات جن میں بندے کی مشیت اور اختیار و آزادی کا ذکر ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱)...... ﴿ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [سورة الدهر: ۲،۳]

''بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لیے پیدا کیا اور اس کو دیکھتا سنتا بنایا۔ ہم نے اسے سیدھی راہ دکھا دی اب چاہے تو شکر کرنے والا بن جائے یا کفر کرنے والا''۔

گویا ہدایت و شکر گزاری کی راہ اختیار کرنا یا اس کے برخلاف کفر و ناشکری کی راہ پر چلنا خود انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے۔ درج ذیل آیت میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

(۲)...... ﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴾ [سورة الشمس: ۷ تا ۱۰]

''قسم ہے نفس کی اور اسے درست کرنے کی۔ پھر (ہم نے) اس کو سمجھ دی برائی کی اور بچ کر چلنے کی۔ جس نے اسے پاک کیا، وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا، وہ ناکام ہوا''۔

(۳)...... ﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

''اور اعلان کر دو کہ یہ سراسر برحق (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے''۔ [سورۃ الکھف:۲۹]

(٤)...... ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴾

''اسی (اللہ) نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا، اس شخص کی نصیحت کے لیے جو نصیحت حاصل کرنے یا شکر گزاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہو''۔ [سورۃ الفرقان:٦٢]

(٥)...... ﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴾ [سورة النبا:٣٩]

''اب جو چاہے اپنے رب کے پاس (نیک اعمال کر کے) ٹھکانہ بنا لے''۔

اب وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت اور بندے کی مشیت کا ٹکراؤ ہو تو اللہ کی مشیت ہی غالب رہتی ہے

(۱)...... ﴿ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ [سورة الدهر:٢٩، ٣٠]

''یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے۔ اب جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کرے اور تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہتا ہے، اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

(۲)...... ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [سورة التكوير: ٢٧تا٢٩]

''یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے جو بھی سیدھا چلنا چاہتا ہو اور تم چاہ نہیں سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ رب العالمین چاہتا ہو''۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے، اس لیے کہ بندے کو جو مشیت ملی ہے، وہ دراصل اللہ کی طرف سے ملی ہے اور ظاہر ہے بندہ خالق کے مقابلہ میں کمزور اور اس کی مشیت خالق کے مقابلہ میں مغلوب ہے۔

نبی کریم ﷺ کے نبی آخرالزماں ہونے کے ناطے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ چونکہ آپ اتنے عظیم الشان نبی ہیں تو شاید آپ کو اللہ نے اپنی مشیئت کے مقابلہ میں طاقتور مشیئت دی ہو، چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس کسی کام کی غرض سے آیا اور اس نے دورانِ کلام آپ ﷺ سے کہا:

((مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ)) ''جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں''۔

تو نبی کریم ﷺ نے اسے فوراً ڈانٹتے ہوئے کہا:

((أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ عَدْلًا [وفی روایة: نِدًّا] بَلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ))(۱)

''کیا تم نے مجھے اللہ کے مقابلہ میں شریک بنا دیا ہے، بلکہ یہ کہو کہ جو اللہ اکیلا چاہے'' (وہی ہوتا ہے)۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شَاءَ فُلَانٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ))(۲)

''اس طرح نہ کہا کرو: 'جو اللہ چاہے اور جو فلاں چاہے'، بلکہ اس طرح کہا کرو: 'جو اللہ چاہے اور پھر جو فلاں چاہے'۔''

یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اللہ کی مشیئت کے ساتھ غیر اللہ میں سے کسی کی مشیئت برابر ہو، اور نہ ہی کسی کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا چاہیے، ہاں انسانی مشیئت اللہ کی مشیئت اور اِذن کے بعد اور اس کے تابع ہوتی ہے۔

حاصلِ بحث

اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے اور اللہ ہی کا حکم ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کائنات میں اس کے حکم و اذن کے برخلاف ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا، تاہم اپنی مخلوقات میں سے انسانوں اور جنات کو اس نے ایک حد تک اختیار اور آزادیٔ عمل کی محدود قوت دے رکھی ہے۔ یہ اختیار کی طاقت اور عمل کی آزادی کتنی ہے، ہم اس کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتے، تاہم یہ اتنی ضرور ہے کہ اس کی بنیاد پر انسان سے

۱۔ مسند احمد، ج۱، ص۲۱۴، ۲۲۴۔ الادب المفرد، للبخاری، ح۷۸۳۔ المعجم الکبیر، للطبرانی، ج۱۲، ص۲۴۴۔ السنن الکبری، للبیهقی، ج۳ص۲۱۷۔

۲۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب لا یقال خبثت نفسی، ح۴۹۸۰۔ مسند احمد، ج۳ص۳۸۴۔

حساب کتاب لیا جائے گا اور اپنے غلط کاموں پر وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میرے پاس تو ان سے بچنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اور نہ ہی اَعمالِ صالحہ بجانہ لانے پر وہ یہ بہانہ کر سکے گا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔

اگر تقدیر کے مسئلہ میں ہم یہ مان لیں کہ اللہ نے ہر انسان کو پہلے ہی سے ایک متعین راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر رکھا ہے تو پھر جزا و سزا، جنت وجہنم، حساب کتاب سب کچھ لایعنی بلکہ ظلم و ناانصافی قرار پاتا ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر واضح اور قرآن وسنت کے دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم و ناانصافی کے شائبہ سے بھی پاک ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴾ [سورة ق: ٢٩]

''اور میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں''۔

اسی طرح ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((لَوْ أَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ أَهْلَ سَمَاوَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَّهُمْ مِّنْ أَعْمَالِهِمْ))[1]

''اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب دینا چاہے تو وہ انہیں عذاب دے سکتا ہے اور وہ انہیں عذاب دینے میں بالکل ظالم نہ ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ تمام (آسمان والوں اور زمین والے) لوگوں پر رحم کرنا چاہے تو اس کی رحمت ان لوگوں کے عملوں سے بہتر ہوگی''۔

اس حدیث کے درست اور صحیح مفہوم دو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے، اس لیے اللہ جو چاہے، اپنی مخلوق کے ساتھ کرے، اسے کسی صورت بھی ظالم نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ اپنی ساری مخلوق کو عذاب ہی کیوں نہ دے دے۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، اپنی پیدا کی ہوئی چیز کے ساتھ کرتا ہے اور وہ خالق اور مالک ہونے کے ناطے ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ایسے کسی کام کو عبث اور فضول بھی معاذ اللہ نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ وہ حکیم و دانا ہے، اور اس کے ہاں ہر کام حکمت و دانائی کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے۔

اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ساری مخلوق کو عذاب دینا چاہتا، تو وہ ان سے

١۔ ابو داؤد، كتاب السنة، باب في القدر، ح ٤٦٩٩، ٤٧٠٠۔

ایسے اعمال کا تقاضا کرتا جسے وہ طاقت رکھنے کے باوجود کما حقہ نہ کر پاتے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرنے اور معاف کر دینے کی بجائے پورا پورا حساب لیتے تو نتیجۃً انہیں ان کی کوتاہی پر سزا مل جاتی اور اللہ پر بھی ظالم ہونے کا الزام عائد نہ ہو پاتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ عمل اور جزا کا نظام ہی بڑا سخت اور مشکل بنا دیتے، مگر اللہ تعالیٰ نے اتنا سخت نظام بنانے کی بجائے انسانوں کے ساتھ رحم و کرم سے کام لیا ہے اور ان کی ہر طرح کی ٹوٹی پھوٹی اور ناقص عبادات و اطاعات بھی اللہ قبول کر لیتے ہیں، علاوہ ازیں چھوٹی موٹی نیکیوں کے ساتھ ہی ان کے کیے ہوئے بہت سے گناہوں کو اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں معاف بھی کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے اس حدیث میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر رحم کرے تو وہ رحم و کرم لوگوں کے اعمال کے مقابلے میں بہتر ہے۔ اس لیے کہ جتنا رحم و کرم اللہ کی طرف سے ہم پر ہوتا ہے، ہمارے اعمال تو اکثر و بیشتر اس کے مستحق ہی نہیں ہوتے۔ اور ہم اللہ کی عبادت و اطاعت کے سلسلہ میں جو عمل بھی کرتے ہیں، یقیناً اس میں اللہ کے حقِ عبادت و اطاعت کو پورا پورا ادا نہیں کر پاتے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ دنیا میں بھی رحم و کرم والا معاملہ کرتے ہیں اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب رہے گی۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ جن احادیث میں یہ ذکر ملتا ہے کہ

((لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا مِّنْکُمُ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهٖ))[1]

"تم میں سے کوئی شخص بھی محض اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں نہیں جا سکتا"۔

ان کا معنی و مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل و کرم کے مقابلہ میں انسان اللہ کی عبادت و اطاعت کے سلسلہ میں جو عمل بھی کرتا ہے، وہ ہمیشہ ناقص رہتا ہے۔ جس طرح اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے کا حق ہے، وہ انسان پورا کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اپنے عمل پر وہ اترانے لگے اور از راہِ فخر یہ سمجھے کہ اب میں جنت کا پکا مستحق ہو گیا ہوں، ایسا نہیں ہے بلکہ جنت میں داخلہ اللہ کے خاص فضل و کرم کے ساتھ ہی ہوگا۔ نیز جو ٹوٹا پھوٹا عمل کرنے کی انسان کو ہمت اور توفیق ہوتی ہے، وہ بھی اللہ کے فضل سے ہوتی ہے۔

۱۔ بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ح ٦٤٦٣۔ مسلم، کتاب صفات المنافقين، باب لن يدخل احد الجنة بعمله، ح ٢٨١٦۔

مشیتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ ہر کام سے پہلے ان شاء اللہ کہا جائے

اسلام میں ہمیں ایک ادب یہ سکھایا گیا ہے کہ ہم ہر اس اچھے کام کے بارے میں ان شاء اللہ کہیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ ان شاء اللہ کا مطلب ہے 'اگر اللہ نے چاہا'۔ اس لیے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن (اجازت) کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا، خواہ وہ اپنا پورا زور لگا لے۔

قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کو اس ادب کے حوالے سے حکم دیا گیا کہ

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا﴾ [سورة الكهف:٢٣،٢٤]

''اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل [یعنی آئندہ کسی وقت] کروں گا، مگر ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ لینا اور جب بھی [ان شاء اللہ کہنا] بھول جاؤ، اپنے پروردگار کی یاد کر لیا کرنا''۔

یعنی اگر کسی وقت ان شاء اللہ کہنا بھول جائے تو یاد آنے پر فوراً ان شاء اللہ کہہ لینا، یا اللہ سے استغفار کرنا اور اس کی حمد وثنا اور ذکر کرنا۔

ان شاء اللہ کہنے کی اہمیت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے ایک کام پر ان شاء اللہ کہا اور مقصود یہ تھا کہ ان شاء اللہ کہنے کی لوگوں کو تعلیم دی جائے اور اس کی اہمیت واضح کی جائے، چنانچہ سورۃ الفتح میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا﴾ [سورة الفتح:٢٧]

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعۂ خواب سچا دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے، سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے، نڈر ہو کر، وہ (اللہ) ان چیزوں کو جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے''۔

نبی کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کے چند سال بعد واقعہ حدیبیہ سے کچھ پہلے ایک خواب دیکھا کہ آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہوئے ہیں اور عمرہ کر رہے ہیں۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ اس خواب کو بشارت سمجھتے ہوئے عمرے کے لیے نکل پڑے مگر راستے میں حدیبیہ کے مقام پر کافروں نے عمرہ کرنے سے روک دیا اور پھر بحث وتکرار کے بعد بالآخر دس سال تک کے لیے صلح کا معاہدہ ہو گیا اور

طے یہ پایا کہ مسلمان اس سال عمرے کے لیے نہیں جائیں گے، البتہ اگلے سال سے عمرے کے لیے مکہ آ سکتے ہیں۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعۃً خواب سچا دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے''۔

اب اللہ کے علم میں تو پہلے سے تھا کہ مسلمان مسجد حرام میں داخل ہوں گے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے یہاں ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) کہا، حالانکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اور ظاہر ہے اس سے ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم دینا اور اس کی اہمیت واضح کرنا ہی مقصود تھا۔

ان شاء اللہ کی اہمیت کے بارے میں چند صحیح احادیث

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایک احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان شاء اللہ کہنے کی پابندی کیا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایسی چند روایات جن میں ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم ملتی ہے، ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ طائف کے محاصرہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّا قَافِلُوْنَ غَدًا اِنْ شَاءَ اللّٰہ))[۱]

''ان شاء اللہ (اللہ نے چاہا تو) کل ہم واپس لوٹ جائیں گے''۔

۲۔ ایک پیشین گوئی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا یَدْخُلُھَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ اِنْ شَاءَ اللّٰہ))[۲]

''مدینہ میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوں گے، ان شاء اللہ!''۔

۳۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جہاد کے لیے بیعت کرنے والوں کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنْ اَصْحَابِ الشَّجَرَۃِ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا تَحْتَھَا اَحَدٌ))

''جن لوگوں نے (حدیبیہ کے مقام پر) درخت کے نیچے (میری) بیعت کی تھی، ان میں سے کوئی بھی

۱۔ بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیئۃ والارادۃ، ح ۷۴۸۰۔

۲۔ بخاری، کتاب الفتن، باب لا یدخل الدجال المدینۃ، ح ۷۱۳۴۔

جہنم میں نہیں جائے گا، ان شاء اللہ!''۔ (۱)

۴۔ مکہ کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْزِلُنَا غَدًا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِخَيْفِ بَنِیْ كِنَانَةَ)) (۲)

''کل ہمارے پڑاؤ کی منزل خیف بنی کنانہ کا مقام ہوگا، ان شاء اللہ!''۔

۵۔ اسی طرح ایک مریض کی عیادت کے لیے آپ ﷺ تشریف لے گئے تو اس سے فرمایا:

((لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰه)) (۳)

''(یہ بخار) تمہیں (گناہوں سے) پاک کردے گا، ان شاء اللہ!''

۶۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا:

''سلیمانؑ نے کہا کہ میں آج رات اپنی ستر بیویوں کے ساتھ قربت کروں گا اور ہر بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کی راہ میں گھوڑے پر بیٹھ کر جہاد کرے گا۔ تو فرشتے نے ان سے کہا کہ ان شاء اللہ کہو مگر سلیمان ان شاء اللہ نہ کہہ سکے۔ پھر انہوں نے ستر (یا ایک سو) بیویوں سے قربت کی مگر کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی، البتہ ایک بیوی حاملہ ہوئی مگر اس نے بھی ناقص بچہ جنم دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو وہ سب اللہ کی راہ میں گھوڑے پر بیٹھ کر جہاد کرنے والے (پیدا) ہوتے''۔ (۴)

۷۔ قسم کھانے والے شخص کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ حَلَفَ فَقَالَ : اِنْ شَاءَ اللّٰه، فَاِنْ شَاءَ مَضٰى وَاِنْ شَاءَ رَجَعَ غَيْرَ حِنْثٍ)) (۵)

۱۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل اصحاب الشجرة، ح ۲۴۹۶۔

۲۔ بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیئة والارادة، ح ۷۴۷۹۔

۳۔ بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیئة والارادة، ح ۷۴۷۰۔

۴۔ بخاری، کتاب الجهاد، باب من طلب الولد للجهاد، ح ۲۸۱۹۔ مسلم، الأیمان، باب الاستثناء، ح ۱۶۵۴۔

۵۔ ابوداؤد، کتاب الایمان، باب الاستثناء فی الیمین، ح ۱۵۳۱۔ ترمذی، کتاب النذور، باب ما جاء فی الاستثناء فی الیمین، ح ۱۵۳۱۔ نسائی، کتاب الایمان، باب من حلف فاستثنی۔ ابن ماجه، کتاب الکفارات، ح ۲۱۰۵۔ مسند احمد، ج ۲ ص ۶، ۱۰، ۴۸۔

''جس نے قسم کھائی اور ساتھ ان شاء اللہ کہا پھر اس کے بعد وہ چاہے تو قسم پوری کرے اور چاہے تو پوری نہ کرے، ایسی صورت میں وہ قسم توڑنے والے کی طرح (کفارہ دینے والا) قرار نہیں پائے گا''۔
یعنی ان شاء اللہ کہہ لینے کے بعد اگر وہ قسم پوری نہیں کرتا تو اس پر قسم توڑنے کا کفارہ لازم نہیں آئے گا۔
اسی طرح اگر وعدہ کرتے وقت کوئی شخص ان شاء اللہ کہتا ہے اور پھر اس وعدے کو پورا نہیں کر پاتا تو اس پر وعدہ خلافی کا گناہ لازم نہیں آئے گا۔

ان شاء اللہ کی اہمیت کے بارے میں ایک مثال

ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم ایک مرتبہ ایک جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ جہاز لندن جا رہا تھا۔ راستے میں غیر مسلم نے مسلمان سے پوچھا: جناب! لندن کتنی دیر تک پہنچ جائیں گے؟ مسلمان نے اپنے اندازے کے ساتھ بتایا کہ اتنی دیر تک ہم لندن پہنچ جائیں گے، اور ساتھ ہی ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) بھی کہا۔ وہ غیر مسلم کہنے لگا: تم نے یہ کیوں کہا کہ اگر اللہ نے چاہا، جب کہ تمہیں پتہ ہے کہ جہاز بالکل صحیح جا رہا ہے، اور بظاہر کوئی مسئلہ بھی نہیں اور ہم فلاں وقت تک یقیناً لندن پہنچ ہی جائیں گے تو مسلمان کہنے لگا: ہم مسلمان اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کچھ کائنات میں ہوتا ہے، سب اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اگر اللہ کی مشیت نہ ہو تو تمام وسائل واسباب کی موجودگی کے باوجود اس کام میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جہاز میں اعلان ہوا کہ حالات کی خرابی کی وجہ سے جہاز لندن کی بجائے پیرس اترے گا۔ تو مسلمان نے اس غیر مسلم سے پوچھا کہ جناب! ہم پیرس کب تک پہنچیں گے تو وہ غیر مسلم کہنے لگا: ان شاء اللہ! فلاں وقت تک ہم پیرس پہنچ جائیں گے:.....!!
یعنی اسے سمجھ آ گئی کہ اصل اختیار اور قدرت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

نعمت پر ماشاء اللہ کہنا چاہیے

قرآن مجید کی سورۂ کہف میں دو آدمیوں کا ایک قصہ مذکور ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کے پاس دو عمدہ اور پھلدار باغ تھے مگر وہ ظالم، متکبر اور اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کی بجائے کفر کرنے والا تھا جب کہ دوسرا آدمی جو صاحبِ ایمان تھا، اسے کہا کرتا تھا کہ اپنے باغ دیکھ کر فخر وغرور کی بجائے مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه پڑھا کرو مگر اس نے ان دعائیہ کلمات اور اللہ کی وحدانیت و کبریائی کو تسلیم کرنے اور اللہ پر ایمان لانے کی بجائے اپنی معاندانہ روش کو جاری رکھا جس کی وجہ سے بالآخر

اللہ تعالیٰ نے آسمانی عذاب کے ذریعے اس کے دونوں باغوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا۔ آئندہ سطور میں قرآن کریم کی وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں یہ واقعہ مذکور ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا وَّكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هٰذِهِ أَبَدًا وَّمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلٰى رَبِّيْ لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّيْ أَحَدًا وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا فَعَسٰى رَبِّيْ أَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهُ طَلَبًا وَأُحِيْطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَا أَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيْ أَحَدًا وَلَمْ تَكُنْ لَّهُ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا﴾ [سورة الكهف: ٣٢ تا ٤٤]

''اورانہیں ان دو آدمیوں کی مثال بھی سنا دے جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے جنہیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی لگا رکھی تھی۔ دونوں باغ اپنا پھل خوب لائے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نہر جاری کر رکھی تھی۔ الغرض اس کے پاس میوے تھے، ایک دن اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور جتھے (نوکر چاکر) کے اعتبار سے مضبوط بھی ہوں۔ اور یہ اپنے باغ میں گیا اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہنے لگا کہ میرا نہیں خیال کہ یہ باغ کسی وقت برباد بھی ہو سکتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر (بالفرض) میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو یقیناً میں (اس لوٹنے کی جگہ کو) اس سے بھی زیادہ بہتر پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کیا تو اس (معبود) سے کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے پھر تجھے پورا آدمی بنایا لیکن میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے، میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں گا۔ تو نے اپنے باغ میں جاتے وقت کیوں نہ کہا کہ [مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ

اِلَّا بِاللّٰہِ] اللہ کا چاہا ہونے والا ہے، کوئی طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد سے۔ اگر تو مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھ رہا ہے (تو) بہت ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے بھی بہتر دے اور اس پر آسمانی عذاب بھیج دے تو یہ چٹیل اور چکنا میدان بن جائے یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تیرے بس میں نہ رہے کہ تو اسے ڈھونڈ لائے۔ اور (پھر اللہ کی طرف سے) اس کے (سارے) پھل گھیر لیے گئے، پس وہ اپنے اس خرچ پر جو اس نے اس میں کیا تھا، اپنے ہاتھ ملنے لگا اور وہ باغ تو اوندھا الٹا پڑا تھا اور وہ (شخص) کہہ رہا تھا کہ کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا۔ اس شخص کی حمایت میں کوئی جماعت نہ اٹھی کہ اللہ سے اس کا کوئی بچاؤ کرتی اور نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا۔ یہیں سے (ثابت ہوا) کہ اختیارات صرف اللہ برحق کی ذات کے لیے ہیں اور وہ ثواب دینے اور انجام کے اعتبار سے بہت ہی بہتر ہے''۔

اس واقعہ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ رقمطراز ہیں کہ

((وَلِهٰذَا قَالَ بَعْضُ السَّلَفِ مَنْ اَعْجَبَهُ شَيْءٌ مِّنْ حَالِهٖ اَوْ مَالِهٖ اَوْ وَلَدِهٖ فَلْيَقُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَهٰذَا مَاْخُوْذٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ الْكَرِيْمَةِ))(۱)

''اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے بعض ائمہ سلف نے بیان کیا ہے کہ جب کسی شخص کو اپنی صورت حال، مال و دولت یا اولاد وغیرہ کو دیکھ کر خوشی محسوس ہو تو اس وقت اسے ما شآء اللہ لا قوۃ الا باللہ (جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے، اللہ کی قوت و طاقت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا) پڑھنا چاہیے۔ اور یہ دعا اسی آیت سے ماخوذ ہے''۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج۳ص ۱۳۷۔

فصل ۴

اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے

تقدیر پر ایمان لانے میں چوتھی چیز یہ شامل ہے کہ انسان اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے، اللہ کے علاوہ کائنات میں اور کوئی خالق نہیں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [سورة الرعد:١٦]

''تمام چیزوں کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے''۔

اسی طرح ایک اور آیت میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [سورة الصافات: ٩٦]

''حالانکہ تمہیں اور جو تم کرتے ہو، اسے اللہ ہی نے پیدا کیا ہے''۔

مطلب یہ کہ ہر وہ حرکت اور عمل جو انسان کرتا ہے، اس میں کرنے کا فعل تو بلاشبہ انسان کا اپنا ہوتا ہے، اور وہ اس فعل، حرکت اور عمل میں آزاد بھی ہوتا ہے مگر اس فعل، عمل یا حرکت کا خالق انسان نہیں ہوتا بلکہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس فعل اور عمل کے پیچھے جتنے اَسباب کارفرما ہوتے ہیں، وہ تمام اَسباب اللہ ہی نے پیدا کیے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے اللہ کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے۔ نیز اگر وہ اسباب نہ ہوتے تو انسان کے لیے ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ اس کام کو کرسکتا جو ان اسباب کی بدولت وہ کرلیتا ہے۔

کیا شر بھی اللہ نے پیدا کیا ہے؟

دنیا میں ہمارے سامنے جو چیزیں ہیں، ان میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ دنیا کی ہر چیز اللہ نے پیدا کی ہے تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو مانا جاسکتا ہے کہ خیر اور اس کے تمام تر ذرائع اور اسباب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے لیکن کیا شر اور اس کے اَسباب و ذرائع کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے.....؟

اس مسئلہ میں نہ صرف غیر مسلم فلاسفہ میں بلکہ مسلمان متکلمین میں بھی اختلاف رہا ہے جبکہ مجوسیوں کا اس بارے میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ خیر اور شر دونوں کے خالق جدا جدا ہیں۔ ان کے بقول خیر کے خالق کا نام 'یزداں' اور شر کے خالق کا نام 'اہرمن' ہے۔ لیکن ظاہر ہے خیر و شر کے دو الگ خالق تسلیم کرنا کسی طرح بھی قرآن

وسنت کی تعلیمات سے موافقت نہیں رکھتا کیونکہ خالق ایک ہی ہے، دو ہرگز نہیں۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ شر کا خالق کون ہے؟ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اس کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے تو بعض اہل علم کے بقول اس سے سوئے ادبی لازم آتی ہے کیونکہ اس میں اللہ کی طرف 'شر' کی نسبت کی جارہی ہے۔لیکن اگر شر کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں تو پھر بھی یہ سوال موجود ہے کہ آخر 'شر' کو کس نے پیدا کیا؟ اور آخر اللہ نے اس کی موجودگی کو کیسے 'برداشت' کرلیا.....؟!

ایک فلسفی نے اس عُقدہ کو اور پیچیدہ بنانے کے لئے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو وہ (خدا) خیر مطلق نہیں ہوسکتا اور اگر شر خدا کی مرضی کے علی الرغم موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں کہلا سکتا!''۔ (۱)

شر کی نسبت اللہ کی طرف کرنے سے چونکہ سوئے ادبی کا اظہار ہوتا تھا، اس لیے مشہور کلامی فرقہ 'قدریہ' نے یہ موقف اختیار کیا کہ انسان بذاتِ خود اپنے افعال کا خالق ہے، وہ اچھا کرے یا برا، اسے ہر لحاظ سے کامل اختیار حاصل ہے حتی کہ وہ خود ہی اپنے افعال کا خالق ہے۔ (۲)

قدریہ کے موقف کے مطابق تقدیر کچھ نہیں بلکہ انسان ہی سب کچھ ہے، وہی انسان خیر پیدا کرتا ہے اور وہی شر کو وجود میں لاتا ہے۔ اور ایک دوسرے کلامی فرقہ جبریہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے الٹا یہ موقف اختیار کرلیا کہ انسان خود کچھ بھی نہیں کرتا، بلکہ اللہ کی تقدیر کے آگے پوری طرح مجبور ہے۔ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ خیر تو خدا پیدا کرتا ہے مگر شر کو انسان وجود بخشتا ہے۔ اسی طرح کی رائے کا اظہار مولانا امین اَحسن اصلاحی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''رہ گیا یہ سوال کہ کیا خیر وشر دونوں کا خالق ایک ہی ہے یا ان کے الگ الگ خالق ہیں؟ اگر خیر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور شر کا خالق کوئی اور ہے تو اس سے کائنات میں ثنویت لازم آتی ہے اور اگر خدا ہی خیر اور شر دونوں کا خالق ہے تو خدا جب خیر مطلق ہے تو وہ شر کا خالق کس طرح ہوسکتا ہے؟ تو اوپر کی بحث سے یہ

۱۔ دیکھیے: کتاب التقدیر، از: غلام احمد پرویز، ص ۱۲۲۔ پرویز کے بقول یہ بات طامس ایکوینس Thomas Aquinas کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اور اس نے اس جگہ غلطی یہ کی ہے کہ 'مرضی' اور 'مشیت' میں فرق نہیں کیا۔

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "شرح العقیدة الطحاویة"، ص ۴۴۰۔

بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے اختیار و ارادہ کے غلط استعمال کی وجہ سے دنیا میں شر پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنے اختیار کو خیر کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے اور وہ اس کو بدی کے لیے بھی بروئے کار لا سکتا ہے۔ یہ کائنات جن طبیعی قوانین پر قائم ہے، ظاہر ہے کہ وہ خالق کے لحاظ سے موجب خیر ہیں لیکن ان کے علم یعنی سائنس کو انسان کی خدمت میں بھی لگا دیا جا سکتا ہے اور مہلک ہتھیار بنا کر انسان کی تباہی کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، چھری پھل کاٹنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے لیکن اس سے دوسرے انسان کو ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اب آپ کا اختیار ہے کہ آپ ایٹمی طاقت کو انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کریں یا اس کی تباہی کے لیے۔ اگر آپ ایٹمی طاقت کو انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے اور نسل انسانی کی تباہی کے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کو اس کا اختیار حاصل ہے لیکن یہ اختیار کا غلط استعمال ہوگا۔ چونکہ اختیار و ارادہ کی آزادی تو بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہی نعمت تو اس کا درجہ حیوانات سے بلند کر کے اسے منصبِ خلافت پر فائز کرتی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اختیار کی آزادی سے پیدا ہونے والے شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ تو سراسر خیر ہے۔ یہ انسان کی نالائقی ہے کہ وہ اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے اور شر کا باعث بنتا ہے۔"[1]

لیکن اس پر پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اختیار کی طاقت جس کے غلط استعمال سے شر پیدا ہوا، وہ بھی تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ پھر اس سے جو شر پیدا ہوا وہ بھی تو اللہ نے تقدیر میں لکھ رکھا تھا۔ پھر بذات خود انسان جو "شر کا باعث بنتا ہے" اسے بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔ جب بالواسطہ یا بلا واسطہ ہر قسم کی خلق کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ثابت ہوتا ہے تو پھر پہلے ہی قرآن کے بقول یہ تسلیم کیوں نہ کر لیا جائے کہ

﴿ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [سورة الرعد:١٦]

"تمام چیزوں کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے"۔

شر اللہ نے پیدا کیا ہے یا انسان کا سوئے اختیار اسے پیدا کرتا ہے؟ اس اختلاف کی وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں شر، ضرر، مصیبت وغیرہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اور بعض میں انسان کی طرف کی گئی ہے، جس سے ایک طرف ان آیات میں ظاہری طور پر تعارض کی شکل پیدا ہوتی ہے اور دوسری

١۔ "المیزان"، ص ٢٠٤، ٢٠٥۔ مقالہ: "خیر و شر کا مسئلہ" از مولانا امین احسن اصلاحی۔

طرف مذکورہ بالا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں جمہور اھل السنۃ والجماعۃ کا موقف کیا ہے؟ اس کی ترجمانی عقیدۃ طحاویۃ کے شارح نے بڑی تفصیل و عمدگی کے ساتھ اس کتاب کی شرح میں کردی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:

"وافعال العباد هي خلق الله وكسب من العباد"[1]

''انسانوں کے افعال، فعل ہونے کے اعتبار سے انسانوں ہی کے ہوتے ہیں مگر خلق کے اعتبار سے ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے''۔

اسے آپ یوں سمجھئے کہ بدکاری اور گناہ وغیرہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نہیں کرتا بلکہ بندے کرتے ہیں مگر یہ چیزیں پیدا تو اللہ تعالیٰ ہی نے کی ہیں۔

اب اس پر سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ چیزیں یا بالفاظ دیگر انسان میں جو گناہ کی خواہش اور اختیار کے غلط استعمال کا محرک پیدا ہوتا ہے، یہ کیوں ہوتا اور کون کرتا ہے؟ کیا اس میں اللہ کا اذن یا مرضی شامل ہے یا نہیں؟؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ آزمائش اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسان میں خواہشاتِ نفس پیدا نہ کردی جاتیں اور انہیں اچھے یا برے مقصد میں استعمال کرنے کا اختیار نہ سونپ دیا جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں خواہشات بھی پیدا کیں اور ان کے اچھے یا برے استعمال کا اختیار بھی انسان کو دے دیا اور خیر و شر دونوں طرف لے جانے والے اسباب و ذرائع بھی پیدا کردیئے مگر اس کے باوجود اپنی مرضی بھی بتادی کہ ...... میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری اطاعت کرو، خواہشات کو میری رضا کے تابع کرو، اچھائی و بھلائی کی راہ اختیار کرو۔ اور اس کے بدلہ میں، میں تمہیں جنت کی دائمی نعمتوں سے نوازدوں گا ...... اس کے ساتھ تاکید مزید کے لیے یہ بھی بتادیا کہ میری نافرمانی و حکم عدولی گناہ ہے، گناہ کو میں بالکل پسند نہیں کرتا، اس کی سزا دنیوی ابتری اور اخروی عذاب کی شکل میں تمہیں ضرور دی جائے گی۔ اسی آزمائش اور امتحان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ ۨ الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ

---

[1] العقيدة الطحاوية مع شرح ابن ابي العز، ص ٤٣٨۔

اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ [سورۃ الملک:۱،۲]

''بہت بابرکت ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے؟''

شر کی نسبت اللہ کی طرف کرنے کا مسئلہ

قرآن وحدیث میں شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بالعموم اس لیے نہیں کی گئی کہ اس سے کہیں اللہ کے بارے میں کوئی سوئے ادبی کا احتمال نہ ہو۔ اس احتمال کے پیش نظر کہیں شر، ضرر اور مصیبت وغیرہ کو انبیاء کرام نے اپنی طرف اور کہیں شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس لیے کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں شر پھیلے، خیر ختم ہو اور لوگ شر کے ارتکاب سے اس کے ساتھ جہنم میں جائیں۔ شر اور اس سے متعلقہ صورتوں کی نسبت انسان ہی کی طرف یا شیطان کی طرف کیے جانے سے متعلقہ چند آیات درج ذیل ہیں:

﴿وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الشَّيۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ﴾ [ص:۴۱]

''اور ہمارے بندے ایوب کا (بھی) ذکر کر جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے رنج اور دکھ پہنچایا ہے''۔ [حالانکہ شیطان تو کسی چیز کا خالق نہیں ہے]

﴿فَاِنِّىۡ نَسِيۡتُ الۡحُوۡتَ وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ اَنۡ اَذۡكُرَهٗ﴾ [سورۃ الکہف:۶۳]

''(حضرت موسیٰ کے غلام کہنے لگے کہ) پس میں تو مچھلی بھول گیا تھا اور دراصل شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کروں''۔

﴿فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى عَلَيۡهِ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ﴾

''حضرت موسیٰ نے اس کو مکا مارا جس سے وہ مر گیا تو موسیٰ کہنے لگے: یہ تو شیطانی کام ہے، یقیناً شیطان دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے''۔ [سورۃ القصص:۱۵]

﴿رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ [الاعراف : ۲۳]

''(حضرت آدم نے کہا) اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

﴿وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ﴾ [سورۃ الشوریٰ : ۳۰]

''اور تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کا بدلہ ہے''۔

﴿ مَآاَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآاَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ﴾ [سورة النساء : ٧٩]

''تمہیں جو بھلائی ملتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے''۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نمازِ تہجد میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((...... وَالۡخَيۡرُ كُلُّهُ فِيۡ يَدَيۡكَ وَالشَّرُّ لَيۡسَ اِلَيۡكَ))(١)

''......اور ساری خیر تیرے ہاتھوں میں ہے اور شر تیری طرف سے نہیں ہے''۔

مذکورہ بالا آیات اور حدیث میں شر کی نسبت اللہ کی بجائے خود انسان یا شیطان کی طرف کرنے کا مقصد اَدبِ الٰہی کا لحاظ ہے ورنہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ انسان یا شیطان شر کا خالق بن گیا ہے بلکہ حقیقی طور پر سب کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم اور اذن سے ہوتا ہے، باقی رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی بھی اس میں شامل حال ہوتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ انسان خیر و بھلائی کی راہ اختیار کرے اور شر کی راہ اختیار نہ کرے۔ تاہم دنیا میں جو شر پیدا ہوتا ہے وہ بھی اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں ہوتا۔ گویا اِذنِ الٰہی اور رضائے الٰہی میں فرق ہے۔

ہم نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس کی تائید درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

﴿ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِاللّٰهِ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡاهٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِاللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَايَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا﴾ [سورة النسآء : ٧٨]

''اگر انہیں کوئی بھلائی ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے (اے نبیؐ!) آپ کہہ دیجئے! کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے آخر انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے''۔

مذکورہ بالا آیت میں قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِاللّٰهِ کے الفاظ یہ واضح کرتے ہیں کہ خیر ہو یا شر، سب کچھ اللہ ہی کے اِذن و مشیت سے ہوتا ہے۔

......☆......
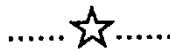
١۔ مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ودعائه بالليل، ح ٧٧١۔

باب ۳

تقدیر سے متعلقہ صحیح احادیث......ایک اِجمالی مطالعہ

کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی اللہ نے تقدیر لکھ دی تھی

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ))[1]

''اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے ہی کہ جب اس کا عرش پانی پر تھا، مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں''۔

۲۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ: اُكْتُبْ، قَالَ مَا اَكْتُبُ؟ قَالَ اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ))[2]

''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اس سے کہا: 'لکھ'۔ اس نے کہا: 'کیا لکھوں؟' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کچھ ہونے والا ہے سب لکھ دے، چنانچہ اس نے اللہ کے حکم سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، سب لکھ دیا''۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّيْ رَجُلٌ شَابٌّ وَاَنَا اَخَافُ عَلٰى نَفْسِي الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَآءَ فَسَكَتَ عَنِّيْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّيْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّيْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَا اَبَاهُرَيْرَةَ! جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰى ذٰلِكَ اَوْ ذَرْ))

۱۔ مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ، ح۲۶۵۳۔

۲۔ ابوداؤد، کتاب السنة، باب فی القدر۔ ترمذی، کتاب القدر۔ احمد، ج۵، ص۳۱۷۔

''یارسول اللہ! میں نوجوان شخص ہوں اور مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں زنا نہ کر بیٹھوں جبکہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ جس پر میں کسی عورت سے شادی کرسکوں، [گویا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خصی ہونے کے بارے میں رخصت چاہ رہے تھے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے کہا: کیا پھر میں خصی نہ ہوجاؤں؟] مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دوبارہ یہی گزارش کی مگر حضور خاموش رہے۔ پھر تیسری بار یہی گزارش کی تو آپؐ نے فرمایا: ابوہریرہ! جو کچھ تم کروگے اسے (لوح محفوظ میں) لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے خواہ تم خصی ہو جاؤ یا خصی ہونے سے باز رہو۔''(۱)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ))(۲)

''ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے یہاں تک کہ دانائی اور نادانی بھی''۔

تشریح

مذکورہ بالا تمام احادیث میں اللہ کے پیشگی علم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی ہر طرح کا علم رکھتے تھے، اس لیے اللہ نے ہر چیز کے بارے میں پہلے سے اس کے کوائف لکھ رکھے ہیں اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اسی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی صفت علم کی وسعت اور ہمہ گیریت کا اظہار ہے جس سے ایک بندۂ مومن کا اللہ کی وحدانیت اور قدرت پر ایمان بڑھتا ہے۔

تقدیر کے مسئلہ میں حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مباحثہ

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِحْتَجَّ آدَمُ ؑ وَمُوسَىٰ ؑ فَقَالَ لَهُ مُوسَىٰ ؑ: يَا آدَمُ! أَنْتَ أَبُونَا خَيَّبْتَنَا وَأَخْرَجْتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ، قَالَ لَهُ آدَمُ ؑ، يَا مُوسَىٰ! اِصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِكَلَامِهِ وَخَطَّ لَكَ بِيَدِهِ أَتَلُومُنِيْ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدَّرَ اللّٰهُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِيْ بِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ فَحَجَّ آدَمُ ؑ مُوسَىٰ ؑ، فَحَجَّ آدَمُ ؑ مُوسَىٰ ؑ، ثَلَاثًا))

۱۔ بخاری، کتاب النکاح، باب مایکرہ من التبتل والخصاء، ح ۵۰۷۶۔

۲۔ مسلم، کتاب القدر، باب کل شیء بقدر، ح ۲۶۵۵۔

''آدم اور موسیٰ علیھما السلام نے (اپنے پروردگار کے سامنے) مناظرہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اے آدم! آپ ہمارے باپ ہیں مگر آپ ہی نے ہمیں محروم کر دیا اور جنت سے نکال دیا۔ آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ! آپ کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ہم کلامی کا شرف بخشا اور اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے تورات کو لکھا۔ کیا آپ مجھے ایک ایسے کام پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ بالآخر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، (راوی کا بیان ہے کہ) یہ آخری جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دہرایا''۔[1]

۲۔ ایک اور روایت جو ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں:

((قَالَ آدَمُ، اَنْتَ مُوسٰی الَّذِی اصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِرِسَالَتِهٖ وَبِكَلَامِهٖ وَاَعْطَاكَ الْاَلْوَاحَ فِيْهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَیْءٍ وَقَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَ اللّٰهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ؟ قَالَ مُوسٰی بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا، قَالَ آدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا: ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰی﴾ قَالَ نَعَمْ، قَالَ: اَفَتَلُوْمُنِیْ عَلٰی اَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیَّ اَنْ اَعْمَلَهُ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَنِیْ بِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَحَجَّ آدَمُ مُوسٰی))[2]

''حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: تم موسیٰ ہو جسے اللہ نے اپنی رسالت و نبوت اور ہم کلامی کا شرف بخشا اور تمہیں تختیاں دیں جن پر ہر چیز واضح مذکور تھی (یعنی تورات دی) اور تمہیں سرگوشی کے لیے تقرب کی عزت بخشی، یہ بتاؤ کہ اللہ نے تورات میری پیدائش سے کتنا عرصہ پہلے لکھی تھی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے چالیس سال پہلے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا: یہ بتاؤ کیا اس میں یہ لکھا تھا کہ ''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راستے سے ہٹ گیا''؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: ہاں لکھا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام کہنے لگے پھر تم مجھے ایک ایسی چیز پر ملامت کیوں کرتے ہو جس کے بارے میں اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے سے لکھ رکھا تھا کہ میں وہ کام کروں گا؟! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے''۔

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب تحاج آدم وموسیٰ عند اللہ عز وجل، ح ۶۶۱۴۔

۲۔ مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ، ح ۲۶۵۲۔

تشریح

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین یہ واقعہ ظاہر ہے اس دنیا میں پیش نہیں آیا۔ اس لیے ان دونوں نبیوں کے مابین طویل زمانے کا فاصلہ ہے۔ نیز مسلم کی حدیث میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ یہ جھگڑا اللہ کی بارگاہ میں ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دراصل حضرت آدم علیہ السلام پر اس بات پر اعتراض وملامت کر رہے تھے کہ آپ نے خوامخواہ ایک غلطی کی اور ہم سب کو جنت سے نکلوا کر دنیا میں رہنے کی مصیبت میں ڈال دیا۔ حالانکہ اس غلطی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی کیونکہ ایک تو یہ اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو چکا تھا کہ انسانوں کو زمین پر آباد کیا جائے گا اور آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے کا ظاہر ہے کوئی نہ کوئی سبب بننا تھا اور وہ بن گیا۔ اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام نے کوئی اور جواب دینے کی بجائے سیدھا یہ جواب دیا کہ جب تمہیں دی جانے والی تورات میں لکھا ہے کہ میری پیدائش سے چالیس سال پہلے ہی اللہ نے میری اس غلطی کے بارے میں لکھ دیا تھا تو پھر مجھ پر اعتراض کس بات کا؟!

دوسری بات یہ ہے کہ اس غلطی کو جب اللہ نے ان کی توبہ کے بعد معاف کر دیا تو اب اس پر ملامت کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

اس حدیث کے پیش نظر بعض لوگ اپنے گناہوں پر تقدیر کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ نے [شفاء العلیل، ص ۴۸ پر] اس نقطہ نظر کی تردید میں یہ رائے اختیار کی ہے کہ گناہ پر تقدیر کا سہارا لینا بعض دفعہ مفید ہوتا ہے اور بعض دفعہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ مفید اس وقت ہوتا ہے جب انسان گناہ کے سلسلہ میں تقدیر کا سہارا اس وقت لے جب وہ اپنے گناہ سے توبہ کر چکا ہو اور گناہ بھی چھوڑ چکا ہو۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض پر) حضرت آدم علیہ السلام نے کیا۔ اور اگر انسان اس وقت تقدیر کا سہارا لے جب وہ کسی حرام کا ارتکاب یا فرض سے پہلوتہی کر رہا ہو یا آئندہ کرنا چاہتا ہو اور ملامت کرنے والوں پر اعتراض کرے کہ میری تو تقدیر میں ایسے ہی لکھا ہے، تو اس جگہ تقدیر کا سہارا لینا اس کے لیے نقصان دہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے مشرکین شرک اور غیر اللہ کی عبادت بھی برابر کرتے رہے اور ساتھ تقدیر کا سہارا لے کر یہ بھی کہتے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے آباؤاجداد شرک کرتے''۔ خلاصہ یہ کہ گناہ کے کاموں میں تقدیر کا سہارا اس وقت لیا جا سکتا ہے جب اس گناہ پر ملامت کا جواز ختم ہو چکا ہو (یعنی اس گناہ سے توبہ کر لینے کے بعد یا اس کی دنیوی سزا پا لینے کے بعد)، اور اگر ملامت

کا جواز ابھی موجود ہو تو پھر تقدیر کا سہارا لینا درست نہیں ہے۔

جو چیز انسان کی استطاعت سے باہر ہو اس پر تقدیر کا سہارا لیا جا سکتا ہے

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَيْلَةً، فَقَالَ: اَلَا تُصَلُّوْنَ؟ قَالَ عَلِيٌّ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ اَنْفُسَنَا بِيَدِ اللّٰهِ فَاِذَا شَاءَ اَنْ يَّبْعَثَنَا بَعَثَنَا، فَانْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِيْنَ قُلْتُ لَهُ ذٰلِكَ، وَلَمْ يَرْجِعْ اِلَيَّ شَيْئًا ثُمَّ سَمِعْتُهُ وَهُوَ مُدْبِرٌ يَضْرِبُ فَخِذَهُ وَهُوَ يَقُوْلُ: ﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴾ [سورة الكهف: ٥٤])) [1]

''ایک رات نبی کریم ﷺ میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ہم سے کہا: تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ تو علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ کے رسول! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب اللہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھا دیتا ہے۔ میری یہ بات سن کر نبی کریم ﷺ واپس ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا پھر میں نے سنا کہ واپس جاتے ہوئے آپ اپنی ران پر ہاتھ مار رہے تھے اور ساتھ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ''اور انسان تمام چیزوں سے زیادہ جھگڑالو ہے''۔

۲۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ایک رات ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ یہاں رات کاٹنے کے لیے پڑاؤ کر لیں تو اچھا ہو۔ آپ ﷺ نے کہا کہ مجھے خطرہ ہے کہ تم نماز فجر کے لیے اٹھ نہیں پاؤ گے۔ [سفر کی تھکاوٹ کے پیش نظر آپ ﷺ نے یہ بات کہی] تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں اٹھانے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ چنانچہ لوگ سو گئے اور حضرت بلال اپنی سواری کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے مگر انہیں بھی نیند آ گئی۔ ادھر جب نبی کریم ﷺ اٹھے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے بلال کو اٹھایا اور کہا کہ تم نے کیا کہا تھا؟ بلال کہنے لگے اے اللہ کے رسول! مجھے اس سے پہلے کبھی ایسی نیند نہیں آئی جیسی آج رات آئی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے فرمایا:

۱۔ بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیئة والارادة، ح ۷۴۶۵؛ مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب ما روی فیمن نام اللیل اجمع حتی اصبح، ح ۷۷۵۔

((إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَآءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَآءَ))[1]

''اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا تمہاری روحیں قبض کر لیں اور جب اللہ نے چاہا انہیں واپس کر دیا''۔

تشریح

ان دونوں حدیثوں میں ایسے معاملے پر تقدیر کا سہارا لیا گیا ہے جو انسانی استطاعت سے باہر تھا مثلاً پہلی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقدیر کا سہارا لیتے ہوئے یہ بات کہی کہ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیں رات کو اٹھنے اور نماز پڑھنے کی توفیق دے دیتا ہے اور جب منظور نہیں ہوتا تو وہ ہمیں سویا ہی رہنے دیتا ہے۔ اس بات کو اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا مگر اس پر کوئی ملامت بھی نہیں کی، اس لیے کہ اس میں تقدیر کی بنیاد پر کسی ایسے عمل کو چھوڑنے پر استدلال نہیں کیا گیا جو انسان کی استطاعت میں ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری حدیث میں یہی بات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ---- جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اور آپ کے ساتھ موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ایک رات تھکاوٹ کی وجہ سے سوئے رہ گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنہوں نے سب کو اٹھانے کی ذمہ داری لی تھی، وہ بھی تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے ---- اپنے صحابہ سے کہی کہ

((إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَآءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَآءَ))

''اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا تمہاری روحیں قبض کر لیں اور جب اللہ نے چاہا انہیں واپس کر دیا''۔

ان احادیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان اپنی انسانی کوشش کی حد تک عمل کی دنیا میں تمام اسباب اختیار کرے اور جہاں اس کا اختیار نہ چل سکتا ہو، یا جو اسباب اس کی استطاعت سے باہر ہوں، وہاں وہ افسوس اور حسرت کا اظہار کرنے کی بجائے اس معاملے کو اللہ اور تقدیر کے سپرد کر دے۔ ایسے ہی موقع کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بھی ارشاد فرمائی ہے:

((وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّيْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ قَدَرُ اللّٰهِ وَمَا شَاءَ اللّٰهُ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))[2]

''اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو (اس کے بعد حسرت اور افسوس سے) یہ نہ کہو: اگر میں یہ کر لیتا تو یہ اس

۱۔ بخاری، کتاب المواقیت، باب الاذان بعد ذهاب الوقت، ح ۵۹۵۔

۲۔ مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان له، ح ۲۶۶۴۔

طرح ہوتا یا (یہ نہ کرتا تو) یہ اس طرح ہوتا۔ بلکہ (نقصان کے بعد) یہ کہو کہ جو اللہ نے مقدر میں لکھا تھا اور جو اس کی مشیت تھی، وہی اس نے کیا۔ کیونکہ 'اگر' کا لفظ شیطان کے عمل کا راستہ کھولتا ہے''۔

اس حدیث کی تشریح آگے عنوان: ''نقصان ہو جانے کے بعد حسرت اور افسوس.....'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

ماں کے پیٹ ہی میں فرشتہ تقدیر لکھ دیتا ہے

۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَكَّلَ اللّٰهُ بِالرَّحِمِ مَلَكًا فَيَقُولُ أَىْ رَبِّ نُطْفَةٌ ؟ أَىْ رَبِّ عَلَقَةٌ؟ أَىْ رَبِّ مُضْغَةٌ؟ فَإِذَا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَقْضِيَ خَلْقَهَا قَالَ: أَىْ رَبِّ ذَكَرٌ اَمْ اُنْثٰى؟ اَشَقِيٌّ اَمْ سَعِيدٌ؟ فَمَا الرِّزْقُ؟ فَمَا الْاَجَلُ؟ فَيُكْتَبُ كَذٰلِكَ فِي بَطْنِ اُمِّهِ))[1]

''اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو کہتا رہتا ہے کہ اے رب! یہ نطفہ بن گیا ہے۔ اے رب! اب یہ جما ہوا خون (علقہ) بن گیا ہے۔ اے رب! اب یہ گوشت کا لوتھڑا (مضغہ) بن گیا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کی پیدائش پوری کر دیں تو وہ پوچھتا ہے کہ اے رب! یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ نیک ہے یا برا؟ اس کی روزی کیا ہوگی؟ اس کی موت کب ہوگی؟ اس طرح یہ سب باتیں ماں کے پیٹ ہی میں لکھ دی جاتی ہیں۔'' (پھر دنیا میں اسی کے مطابق ظاہر ہوتا ہے)

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ اُمِّهِ اَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ مَلَكًا فَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعَةٍ بِرِزْقِهِ وَاَجَلِهِ وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيدٌ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ فَوَاللّٰهِ إِنَّ اَحَدَكُمْ اَوِ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا غَيْرُ ذِرَاعٍ اَوْ بَاعٍ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا غَيْرُ ذِرَاعٍ اَوْ ذِرَاعَيْنِ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا))

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب ۱، حدیث ۶۵۹۵۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن امه.... حدیث ۲۶۴۶۔

”تم میں سے ہر شخص کو ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں رکھا جاتا ہے، پھر اتنی ہی مدت وہ جما ہوا خون (علقہ) کی صورت میں رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت گوشت کا لوتھڑا (مضغۃ) بنا رہتا ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اس انسان کے بارے میں (جب کہ وہ ماں کے پیٹ ہی میں ہوتا ہے) اسے چار باتوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: اس کی روزی کا، اس کی موت کا، اس بات کا کہ وہ سعادت مند ہوگا یا بد بخت۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص دوزخ والوں کے کام کرتا رہتا ہے اور جب اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک بالشت (ہاتھ) کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے اور وہ جنت والوں کے کام کرنے لگ جاتا ہے اور جنت میں جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی جنت والوں کے کام کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت (ہاتھ) کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور اس کی تقدیر اس پر غالب آ جاتی ہے اور وہ دوزخ والوں کے کام شروع کر دیتا ہے اور جہنم میں جا پہنچتا ہے“۔[1]

۳۔ عامر بن واثلہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بد بخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ ہی میں بد بخت لکھا جا چکا اور خوش بخت وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑے تو عامر ایک دوسرے صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ بات بیان کی اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی عمل کرنے سے پہلے ہی (یعنی ماں کے پیٹ ہی میں) بد بخت قرار پائے؟ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس سے کہنے لگے کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو جب کہ میں نے خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا مَرَّ بِالنُّطْفَةِ اثْنَتَانِ وَأَرْبَعُونَ لَيْلَةً بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْهَا مَلَكًا فَصَوَّرَهَا وَخَلَقَ سَمْعَهَا وَبَصَرَهَا وَجِلْدَهَا وَلَحْمَهَا وَعِظَامَهَا ثُمَّ قَالَ: يَارَبِّ! أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثٰى؟ فَيَقْضِي رَبُّكَ مَاشَاءَ وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ ثُمَّ يَقُولُ: يَارَبِّ! أَجَلُهُ؟ فَيَقُولُ رَبُّكَ مَا شَاءَ وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ، ثُمَّ يَقُولُ: يَارَبِّ! رِزْقُهُ؟ فَيَقْضِي رَبُّكَ مَا شَاءَ وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ ثُمَّ يَخْرُجُ الْمَلَكُ بِالصَّحِيفَةِ فِي يَدِهِ فَلَا يَزِيدُ عَلٰى أَمْرٍ وَلَا يَنْقُصُ))

۱۔ بخاری ایضاً، ح ۶۵۹٤۔ مسلم ایضاً، ح ۲۶٤۳۔

''جب نطفہ کو (رحم مادر میں قرار پکڑے) بیالیس دن گزر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں جو اس کی صورت گری کرتا ہے اور اس کے کان، آنکھیں، جلد، گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے۔ پھر کہتا ہے: اے رب! یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں فیصلہ فرماتے ہیں اور وہ فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے: اے رب! اس کی عمر کتنی ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کو جتنی منظور ہوتی ہے، اسے بتاتے ہیں اور وہ فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے: اے میرے رب! اس کا رزق کتنا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں، فیصلہ فرماتے ہیں جسے وہ فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ پھر فرشتہ اس صحیفے کو اپنے ہاتھ میں لے کر چلے جاتا ہے اور اس میں کسی چیز کی کمی بیشی نہیں کرتا''۔ (۱)

تشریح

علماءِ اہل سنت نے تقدیر اور قضا کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے؛ ایک کو قضائے مبرم کہا جاتا ہے اور دوسری کو قضائے معلق۔

قضائے مبرم سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ اللہ کے پاس ہے۔ لوحِ محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہی تقدیر ہے اور کسی انسان، فرشتے یا جن کی اس طرح رسائی نہیں ہے، یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

قضائے معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں مختلف اسباب کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ تقدیر اللہ نے فرشتوں کے سپرد کر رکھی ہے اور جب کبھی اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں ہی کو حکم دیتے ہیں کہ اس میں فلاں فلاں تبدیلی کر دو۔ مذکورہ بالا احادیث میں فرشتوں کے حوالے سے جس تقدیر کا ذکر ہے، اس سے یہی تقدیر مراد ہے۔

ان احادیث میں جہاں یہ بات ہے کہ ''تقدیر غالب آ جاتی ہے''، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تقدیر کے لکھے ہوئے کے سامنے انسان بالکل مجبور ہو جاتا ہے اور اس کا اختیار کلی طور پر ختم ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ غالب آ جاتا ہے اور انسان خود ہی اپنے اختیار سے اپنی لائن بدل لیتا ہے اور وہ کام شروع کر دیتا ہے جن پر اس کا خاتمہ ہونا ہوتا ہے۔ اور کسی انسان کا خاتمہ کس

۱۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ ..... ح ۲۶۴۵۔

حالت اور عمل پر ہوگا، یہ بھی اللہ تعالیٰ نے چونکہ پہلے سے اپنے علم کی روشنی میں لکھ دیا ہے، اس لیے ان احادیث میں کہا گیا کہ اللہ کا لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے۔

بچپن میں فوت ہونے والے بچوں کے بارے میں بھی اللہ کو علم تھا کہ یہ بڑے ہوتے تو کیا عمل کرتے؟!

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ فَقَالَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ))[1]

''نبی کریم ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا (کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ (بڑے ہوکر) کیا عمل کرتے''۔

تشریح

صحابہ کرامؓ کا سوال یہ تھا کہ بچپن میں فوت ہونے والوں نے تو کوئی بھی اچھا یا برا عمل نہیں کیا، اب انہیں جنت یا جہنم کہاں جگہ دی جائے گی۔ اگر تو انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا جائے گا جب کہ ان کا کوئی برا عمل نہیں اور اگر جنت میں جگہ دی جائے تو تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغیر کسی اچھے عمل کے انہیں جنت کیوں ملے گی۔

نبی کریم ﷺ نے واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ اللہ کے علم میں پہلے ہی سے تھا کہ اگر یہ بڑے ہوتے تو کس طرح کے عمل کرتے، لہٰذا انہیں اپنے اسی علم کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ جنت یا جہنم جہاں چاہیں گے، جگہ دیں گے۔

تقدیر پر یقین رکھنا چاہیے

۱۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ

((جَاءَ رَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّا نُصِيبُ سَبْيًا وَنُحِبُّ الْمَالَ كَيْفَ تَرَى فِي الْعَزْلِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَوَ إِنَّكُمْ تَفْعَلُونَ ذٰلِكَ؟ لَا عَلَيْكُمْ أَنْ لَّا تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ لَيْسَتْ نَسَمَةٌ كَتَبَ اللّٰهُ أَنْ تَخْرُجَ إِلَّا هِيَ كَائِنَةٌ))

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب الله اعلم بما کانوا عاملین، ح ۶۵۹۷۔

''قبیلہ انصار کا ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لونڈیوں سے ہم بستری کرتے ہیں اور مال سے محبت کرتے ہیں (اگر ہم عزل کریں تو) آپ کا عزل کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا تم ایسا کرتے ہو! تمہارے لیے اس میں کوئی حرج نہیں اگر تم ایسا نہ بھی کرو تو، کیونکہ جس جان کی بھی پیدائش اللہ نے لکھ دی ہے، وہ ضرور پیدا ہو کر رہے گی''۔[1]

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَسْئَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَإِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا))[2]

''کوئی عورت اپنی کسی (دینی) بہن (یعنی سوکن) کی طلاق کا مطالبہ (اس خیال سے) نہ کرے کہ اس کے رزق کا پیالہ تنہا اپنے ہی لیے خاص کر لے، بلکہ اسے نکاح (سوکن کی موجودگی میں بھی) کر لینا چاہیے کیونکہ اسے اتنا ہی ملے گا جتنا اس کے مقدر میں ہوگا''۔

تشریح

ان دونوں حدیثوں میں تقدیر پر ایمان اور اللہ کی قدرت پر یقین کے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان یہ سمجھتا ہے کہ شاید اپنی کوشش سے میں جو چاہوں، وہی کر سکتا ہوں حالانکہ ضروری نہیں کہ کوشش اور سبب بھی ہمیشہ وہی نتیجہ دے جو انسان فرض کر لیتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسا ہوتا بھی ہے مگر وہ بھی تب ہوتا ہے جب اللہ کی طرف سے مقدر ہو۔

یاد رہے کہ کوشش اور سبب اختیار کرنے سے اسلام میں کبھی منع نہیں کیا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ایک مسلمان کے عقیدے کو ٹھیک رکھنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدیثوں میں صاف بتا دیا کہ سبب کے اختیار کرنے کے باوجود وہی ہوگا جو اللہ نے مقدر کر رکھا ہے۔ اس لیے اس تقدیر پر انسان کو ایمان رکھنا چاہیے اور اس کے بعد مثبت سوچ کے ساتھ عمل کی دنیا میں زندگی گزارنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر پہلے ہی جنتیوں اور جہنمیوں کے بارے میں لکھ رکھا ہے

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی:

۱۔ بخاری، ایضاً، باب قوله : وكان امر الله قدرا مقدورا، ح ۶۶۰۳۔

۲۔ ایضاً، باب قوله : وكان امر الله قدرا مقدورا، ح ۶۶۰۱۔

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ [سورة الاعراف: ١٧٢]

''اور جب آپ کے رب نے آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔ (یہ اقرار اس لیے لیا) تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔''

تو انہوں نے فرمایا کہ اس آیت کے بارے میں یہی سوال اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا گیا اور آپ نے اس کا یہ جواب دیا کہ

((اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِيْنِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَدِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ الْجَنَّةَ وَاِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ النَّارَ......))[1]

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ انہیں میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں والے کام کریں گے۔ پھر کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ انہیں میں نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جہنمیوں والے کام کریں گے۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! پھر کوئی عمل کرنے کی کیا ضرورت؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جنت کے لیے پیدا فرمائیں تو پھر اس سے وہی عمل کرواتے ہیں جو جنتیوں والے عمل ہوں حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ جہنم کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے وہی عمل کرواتے ہیں جو اہل جہنم کے ہوں اور وہ اہل جہنم کے عمل ہی پر مرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ڈال دیتے ہیں''۔

١۔ مؤطا (٨٩٨:٢) احمد (٤٤/١) حاکم (٢٧/١) ابن حبان (٦١٦٦) ابوداؤد: کتاب السنة باب فی سورة الاعراف (٤٧٠٣) شیخ البانیؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا۔ دیکھیے: مشکاة للالبانی، ٩٦۔

۲۔حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جب پیدا فرمالیا تو ان کے دائیں کندھے پر ضرب لگائی اور سفید اولاد نکالی (وہ اس طرح تھی کہ) گویا چیونٹیاں ہوں پھر بائیں کندھے پر ضرب لگائی اور سیاہ اولاد نکالی، گویا کہ وہ کوئلے ہیں۔ دائیں کندھے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھے کوئی پروانہیں، پھر بائیں کندھے والوں کے لیے فرمایا کہ یہ جہنمی ہیں اور مجھے کوئی پروانہیں''۔ [1]

۳۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْجَنَّةَ وَخَلَقَ النَّارَ فَخَلَقَ لِهٰذِهِ اَهْلاً وَلِهٰذِهِ اَهْلاً)) [2]

''اللہ نے جنت اور جہنم کو پیدا کیا ہے اور جنت کے لیے بھی لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جہنم کے لیے بھی''۔

۴۔مسلم ہی کی دوسری حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ! اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ آبَائِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ آبَائِهِمْ)) [3]

''اے عائشہ! اللہ نے جنت کے لیے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے حق میں اس وقت ہی جنتی ہونا لکھ دیا تھا کہ جب ابھی وہ اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے اور جہنم کے لیے بھی لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے حق میں جہنمی ہونا اس وقت ہی لکھ دیا تھا کہ جب ابھی وہ اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے'' (مطلب یہ کہ اللہ نے اپنے علم کی بنیاد پر لوگوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے جنتی یا جہنمی ہونے کا لکھ دیا تھا)۔

۵۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ؟ قُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهَا اَسْمَاءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا

۱۔ مسند احمد (٦/ ٤٤١) شیخ البانیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: السلسلة الصحيحة، ٤٩۔

۲۔ مسلم، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، ح ٢٦٦٢۔

۳۔ مسلم، ایضاً۔

ثُمَّ قَالَ لِلَّذِیْ فِیْ شِمَالِهٖ هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا فَقَالَ أَصْحَابُهُ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ؟ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِّنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ)) [1]

’’ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ (گھر سے) باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: جانتے ہو ان میں کیا ہے؟ صحابہ نے کہا نہیں اللہ کے رسول، مگر یہ کہ آپ ہمیں اس بارے میں بتائیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا: یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جنت اور ان کے آباؤ اجداد اور قبائل وخاندان کے نام درج ہیں۔ اسے اہل جنت کے ناموں کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ پھر آپ ﷺ نے بائیں کتاب کے بارے میں فرمایا کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور اس میں اہل دوزخ کے نام ہیں اور ان کے آباؤ اجداد اور کنبوں قبیلوں کے نام ہیں۔ اسے بھی بند کر دیا گیا ہے اور اس میں اب کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! اگر یہ سب پہلے ہی لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت اور جواز ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے آپ کو (شریعت اور اچھے اعمال پر) قائم دائم رکھو اور (اس طرح اللہ کا) قرب تلاش کرو کیونکہ جو جنتی ہے اس کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیے ہوں اور جو جہنمی ہے اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی عمل کیے ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کتابوں کو رکھ دیا یعنی پیچھے ڈال دیا اور فرمایا: تمہارا پروردگار یہ لکھ کر فارغ ہو چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت جہنمی ہے‘‘۔

۱۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان اللہ کتب کتابا لاهل الجنة واهل النار، ح ۲۱۴۱۔ صحیح ترمذی، ج ۲، ص ۲۲۵۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

''ہم جنگ خیبر میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تھے، اس موقع پر آپ ﷺ نے ایک آدمی جو آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک تھا اور اسلام کا دعوے دار تھا، کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ جب جنگ ہوئی تو اس آدمی نے بڑی ثابت قدمی سے لڑائی لڑی اور بہت زیادہ زخمی ہونے کے باوجود ثابت قدمی دکھائی۔ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں جس شخص کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ وہ جہنمی ہے، اس نے اللہ کے راستے میں بڑی ثابت قدمی کے ساتھ لڑائی کی ہے اور بہت زخم کھائے ہیں! آنحضرت ﷺ نے پھر وہی بات ارشاد فرمائی کہ وہ جہنمی ہے۔ قریب تھا کہ بعض لوگوں کو شک وشبہ ہوتا لیکن اسی دوران اس آدمی نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا ترکش سے ایک تیر نکالا اور اپنے آپ کو ذبح کر لیا (خودکشی کر لی)۔ یہ صورتحال دیکھ کر بہت سے مسلمان دوڑے دوڑے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کی بات سچ کر دکھائی، اس آدمی نے اپنے آپ کو ہلاک کر کے اپنی جان کو خود ہی ختم کر ڈالا ہے۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: اے بلال! اٹھو اور لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومن آدمی ہی داخل ہوگا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت گنہگار آدمی سے بھی لے لیتا ہے''۔ [1]

۷۔ حضرت سہل سے بھی صحیح بخاری میں یہ حدیث الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ

''جب نبی کریم ﷺ کو اس آدمی کی خودکشی کے بارے میں خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهُ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ)) [2]

''بندہ دوزخیوں والے عمل کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے (اسی طرح ایک بندہ) جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے مگر وہ دوزخی ہوتا ہے۔ بے شک عملوں کا اعتبار خاتمہ پر ہے''۔

۱۔ بخاری، ایضاً، باب العمل بالخواتیم، ح ۶۶۰۶۔

۲۔ بخاری، ایضاً، باب العمل بالخواتیم، ح ۶۶۰۷۔

تشریح

مذکورہ بالا تمام احادیث میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کی تخلیق سے پہلے ہی چونکہ علم تھا کہ کون کیا کرے گا، اس لیے اس نے وہ لکھ دیا۔ اور اسی علم میں یہ بھی تھا کہ کون جنتیوں والے عمل کر کے جنت میں جائے گا اور کون جہنمیوں والے عمل کر کے جہنم میں جائے گا، اس لیے اللہ نے یہ بھی پہلے سے ہر انسان کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ لہٰذا اب جو کوئی نیک عمل کرتا ہے وہ گویا جنت میں جانے کا سبب اختیار کرتا ہے، کیونکہ جس کی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا، اس کی تقدیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جنت میں جانے کے لیے نیک عمل کی راہ اختیار کرے گا اور آخر کار نیکی اور ایمان ہی پر مرے گا۔ اور جس کی تقدیر میں جہنم میں جانا لکھا ہے، اس کے بارے میں یقیناً یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جہنمیوں والے عمل کرتے ہوئے مرے گا۔ اب اچھا یا برا عمل انسان کے اختیار میں ہے، وہ چاہے تو جنت میں جانے کے اسباب اپنا لے اور چاہے تو جہنم میں لے جانے والے ذرائع اختیار کر لے۔ اس لیے ان احادیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہی تلقین فرمائی کہ تم اچھے عمل کرو اور اس طرح اللہ کی قربت اور رضا تلاش کرو۔ یعنی آپ ﷺ نے انہیں جنت میں لے جانے والے اسباب اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی اور یہ بھی بتا دیا اچھے عمل گویا اس بات کی نشانی اور علامت ہیں کہ ایسا بندہ اہل جنت میں سے ہے بشرطیکہ وہ مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔

جنت میں جانے کے لیے نیک اعمال کا سبب اختیار کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کی قسمت میں اگر لکھا ہے کہ وہ صاحب اولاد ہوگا تو ظاہر ہے اس کا سبب بھی لکھا ہے کہ وہ شادی کرے گا اور پھر اسے اولاد کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ اگر کوئی یہ سوچ کر عمل و اسباب چھوڑ دے اور شادی نہ کرے کہ ہاں اگر قسمت میں اولاد ملنا مقدر ہوا تو پھر شادی نہ کر کے بھی اولاد مل کر رہے گی تو کیا اسے اولاد ملے گی؟!

ظاہر ہے ایسے شخص کو سب بے وقوف کہیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اسباب بھی مقدر کا حصہ ہوتے ہیں مگر نجانے کیوں عمل کی دنیا میں آ کر ہم فوراً یہ بات بھول جاتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو سیدھے رستے کی ہدایت دے اور اس پر چلنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آئندہ مذکورا احادیث میں بھی اسی پہلو کی مزید توضیح موجود ہے۔

کیا تقدیر پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دینا چاہیے؟

۱۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

((قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيُعْرَفُ أَهْلُ الْجَنَّةِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ فَلِمَ يَعْمَلُ الْعَامِلُونَ؟ قَالَ كُلٌّ يَعْمَلُ لِمَا خُلِقَ لَهُ أَوْ لِمَا يُسِّرَ لَهُ))[۱]

''ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا جنتیوں اور جہنمیوں کے بارے میں (اللہ کے علم میں) پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں۔ تو وہ کہنے لگا پھر عمل کرنے والے عمل کیوں کریں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر شخص وہی عمل کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے---یا فرمایا--- جس کے لیے اسے سہولت دی گئی ہے''۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ إِلَّا قَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ أَوْ مِنَ الْجَنَّةِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ أَلَا نَتَّكِلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ لَا، اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ))[۲]

''تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانہ جنت یا جہنم میں لکھا جا چکا ہے تو وہاں بیٹھے لوگوں میں سے ایک آدمی کہنے لگا: یا رسول اللہ! پھر ہم کیوں نہ اسی پر بھروسہ کر لیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ عمل کرو کیونکہ ہر شخص (اپنی تقدیر کے مطابق) عمل کی آسانی دیا گیا ہے''۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے مروی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے ہر ذی روح اور ہر شخص کا ٹھکانہ جنت یا جہنم میں لکھا جا چکا ہے اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ وہ خوش بخت ہوگا یا کہ بد بخت۔ تو وہاں بیٹھے لوگوں میں سے ایک آدمی کہنے لگا: یا رسول اللہ! پھر ہم کیوں نہ اسی تقدیر پر بھروسہ کر لیں اور عمل چھوڑ دیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو خوش بخت ہے وہ خوش بختوں والے عملوں کی طرف جائے گا اور جو بد بخت ہے وہ بد بختوں والے عملوں کی طرف جائے گا۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم عمل کرتے رہو کیونکہ ہر شخص کے لیے آسانی کی گئی ہے۔ جو خوش بخت ہے اس کے لیے خوش بختوں والے عملوں کو آسان کر دیا گیا ہے اور جو بد بخت ہیں ان کے لیے بد بختوں

۱۔ بخاری ایضاً، باب جف القلم علی علم اللہ، ح ۶۵۹۶۔

۲۔ بخاری ایضاً، باب قولہ: وکان امر اللہ قدرا مقدورا، ح ۶۶۰۵۔

والے عملوں کو آسان کر دیا گیا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ان آیات کی تلاوت کی:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ﴾ [سورۃ اللیل: ۵ تا ۱۰]

''پس جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے) اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی سہولت دیں گے۔ لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پروائی برتی اور نیک بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اس کی تنگی و مشکل کے سامان میسر کر دیں گے''۔[1]

۴۔ ابوالاسود دیلی بیان کرتے ہیں کہ

''مجھے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے کہا: تمہارا اس بارے کیا خیال ہے کہ جو لوگ آج دنیا میں عمل کرتے اور عملوں کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، کیا یہ چیز ایسی ہے جو پہلے سے لکھی جا چکی اور تقدیر کا نوشتہ بن چکی ہے یا یہ وہ عمل ہیں جو اس چیز کے مطابق بعد میں واقع ہوتے ہیں (نہ کہ پہلے ہی سے تقدیر میں لکھے جا چکے) جو انبیاء لے کر آتے ہیں اور جن پر حجت قائم ہوتی ہے؟ تو میں نے کہا: بلکہ یہ ایسی چیز ہے جو تقدیر میں پہلے سے لکھی جا چکی اور جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تو حضرت عمران کہنے لگے پھر کیا یہ ظلم نہیں؟ تو میں ان کی اس بات سے سخت گھبرا گیا اور میں نے کہا ہر چیز اللہ کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہے لہٰذا وہ جو کچھ کرتا ہے، کوئی اس سے اس بارے پوچھنے کا مجاز نہیں مگر جو لوگ کرتے ہیں وہ اس (اللہ) کے ہاں اس کے جواب دہ ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا اللہ تجھ پر رحم کرے، میں نے تم سے یہ سوال صرف اس لیے کیا کہ تمہارے فہم و بصیرت کا امتحان لے سکوں۔ سنو (میں تمہیں حدیث سناتا ہوں، پھر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ) قبیلہ مزنیہ کے دو آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں اس بارے میں بتایئے کہ جو لوگ آج (دنیا میں) عمل کرتے اور عملوں کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، کیا یہ چیز ایسی ہے جو پہلے سے لکھی جا چکی اور تقدیر کا حصہ بن چکی ہے یا یہ وہ عمل ہیں جو اس چیز کے مطابق بعد میں واقع ہوتے ہیں (نہ کہ پہلے ہی سے تقدیر میں لکھے جا چکے) جو انبیاء لے کر آتے ہیں اور جن پر حجت قائم ہوتی ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ ایسی چیز ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور تقدیر میں یہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے''۔[2]

۱۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ..... ح ۲٦٤٧۔ ۲۔ مسلم، ایضاً، ۲٦٥۰۔

تشریح

ان احادیث کی تشریح بھی تقریباً وہی بنتی ہے جو اس سے پچھلی سرخی کے تحت مذکور احادیث کے ضمن میں کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر پہلے ہی سے اندازہ کر کے لکھ دیا ہے کہ کون کیا کرے گا، کون سی چیز کب اور کیسے اور کن اسباب واوصاف کے ساتھ رونما ہوگی اور پھر کائنات میں اللہ کے اسی اندازے اور علم کے مطابق سب کچھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اللہ کی شان وشوکت اور عظمت وکبریائی کی علامت ہے کہ اسے اتنا وسیع اور محکم علم ہے۔ ورنہ اتنی بڑی کائنات میں روز عجیب وغریب جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اگر معاذ اللہ اس کائنات کے خالق کو ان کا پہلے سے اندازہ نہ ہوتا کہ اس کی کائنات میں یہ کچھ ہوگا تو وہ اپنی کائنات کا نظام چلانے میں ناکام ہو جاتا، نعوذ باللہ!

اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے سب علم تھا اور اس نے وہ علم لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے اور اسی کے مطابق سب کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تقدیر کے لکھے ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا، بلکہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے، البتہ اللہ کو پہلے سے علم ہے کہ انسان اس اختیار کو اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے گا یا اس کی نافرمانی میں اور اس کے نتیجہ میں اسے جنت میں جگہ ملے گی یا جہنم میں، اور یہی بات اللہ نے لکھ رکھی ہے۔

علاج معالجہ اور دیگر اسباب اختیار کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے

ا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((قَالَتِ الْاَعْرَابُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! اَلَا نَتَدَاوٰى؟ قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ! تَدَاوَوْا، فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً اَوْ دَوَاءً اِلَّا دَاءً وَاحِدًا، فَقَالُوْا يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا هُوَ؟ قَالَ اَلْهَرَمُ))

''کچھ دیہاتی لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، اے اللہ کے رسول! کیا ہم دوا استعمال نہ کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ کے بندو! دوا استعمال کرو، بے شک اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس کی شفا اور دوا بھی ساتھ نہ اتاری ہو، سوائے ایک بیماری کے۔ انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون سی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ بڑھاپا ہے''۔ [1]

1۔ ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء في الدواء والحث عليه، ح ۲۰۳۸۔

۲۔ابوخزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

((سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰى بِهِ وَتُقَاةً نَتَّقِيهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قَالَ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ))[۱]

''میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو ہم علاج کے لیے دوا استعمال کرتے ہیں اور دم جھاڑ وغیرہ کرواتے ہیں۔ کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر میں کوئی تبدیلی کرتی ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ چیزیں بھی تقدیر کا حصہ ہیں''۔

تشریح

بعض لوگ علاج معالجہ کے سلسلہ میں تقدیر کا بہانہ بناتے ہیں کہ اگر قسمت میں شفا لکھی ہوئی تو بغیر علاج کے مل جائے گی اور نہ لکھی ہوئی تو نہیں ملے گی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بھوکا یہ کہے کہ اگر قسمت میں مقدر ہے کہ پیٹ بھرے گا تو کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں، پیٹ بھر ہی جائے گا۔ اگر قسمت میں لکھا ہے کہ اولاد ملے گی، اب میں شادی کروں یا نہ کروں، بہرصورت اولاد مل کر رہے گی!

حالانکہ تقدیر میں لکھے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اسباب کی راہ اختیار نہ کرے، بلکہ اسباب اختیار کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے کیونکہ تقدیر میں اگر لکھا ہے کہ شفا ہوگی تو اس کا سبب بھی لکھا ہے کہ فلاں دوا کھانے سے شفا ہوگی۔ نیز اوپر مذکور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ علاج معالجہ کے اسباب اختیار کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے۔

موت کا سبب بھی اللہ کی طرف سے تقدیر میں لکھا جاچکا ہوتا ہے

حضرت ابوعزۃ [یسار بن عبد رضی اللہ عنہ] سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَمُوتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً))[۲]

''اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کی تقدیر میں یہ لکھا ہو کہ یہ فلاں جگہ مرے گا تو اسے اس جگہ جانے کی کوئی ضرورت ڈال دیتے ہیں''۔

۱۔ ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرقی والادویۃ، ح ۲۰۶۵۔ ایضاً، کتاب القدر، ح ۲۱۴۹۔

۲۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان النفس تموت حیث ما کتب لها، ح ۲۱۴۷۔

تشریح

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ موت کا سبب بھی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔ اب ایک شخص کی موت اپنے شہر یا اپنے ملک سے باہر کسی اور شہر یا کسی اور ملک میں لکھی ہے تو موت کے وقت کسی نہ کسی ضرورت کے پیش وہ اس جگہ ضرور پہنچ جاتا ہے۔

یہی صورتحال خودکشی کرنے والے کی ہے۔ اگر کسی کی تقدیر میں لکھا ہے کہ یہ خودکشی کے ساتھ مرے گا، تو وہ اسی طرح مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ موت کا وقت خودکشی کرنے والے کے ہاتھ میں ہے، جب چاہے مر جائے۔ بلکہ موت تو اسی وقت آئے گی جب اس کا مقرر شدہ وقت آ جائے گا اور اگر ابھی وقت نہ آیا ہو تو خودکشی کرنے کے باوجود اللہ بچا لیتے ہیں!!

نذر اور منت سے تقدیر نہیں ٹلتی

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا:

((اِنَّهُ لَا يَرُدُّ شَيْئًا اِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ))[1]

''نذر کسی چیز کو نہیں لوٹاتی، نذر صرف بخیل کا پیسہ نکالتی ہے''۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَاْتِي ابْنَ آدَمَ النَّذْرُ بِشَيْءٍ لَمْ يَكُنْ قَدْ قَدَّرْتُهُ وَلٰكِنْ يُلْقِيْهِ الْقَدَرُ وَقَدْ قَدَّرْتُهُ لَهُ اَسْتَخْرِجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ))[2]

''نذر انسان کو کوئی ایسی چیز نہیں دیتی جو اللہ نے اس کے لیے اس کی تقدیر میں نہ لکھی ہو بلکہ وہ تقدیر دیتی ہے جو میں نے اس کے لیے لکھ دی ہے''۔

تشریح

نذر اور منت ماننا ایک عبادت ہے جو شخص کسی کام کے لیے نذر مانے تو پھر اسے وہ نذر پوری کرنی چاہیے، بشرطیکہ نذر کسی گناہ اور شرک کے کام میں نہ مانگی گئی ہو اور نہ ہی وہ نذر اس انسان کی استطاعت سے باہر ہو۔

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب القاء النذر العبد الی القدر، ح ۶۶۰۸۔

۲۔ بخاری، ایضاً، ح ۶۶۰۹۔

مگر نذر کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے کوئی مصیبت جو تقدیر میں لکھی ہے، وہ ٹل جائے گی یا تقدیر بدل جائے گی۔ سوائے اس کے کہ اس کی تقدیر میں اگر لکھا ہے کہ یہ نذر کا سبب اختیار کرے گا اور اس کی بدولت اس کی تقدیر میں فلاں تبدیلی ہوگی (جیسا کہ تقدیر معلق کے سلسلہ میں علماء اہل سنت کا موقف ہے) تو یہ اور بات ہے۔

تقدیر اور اللہ کی توفیق

۱۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

((اَلَا اُعَلِّمُكَ كَلِمَةً هِيَ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ؟))

''کیا میں تمہیں ایک ایسا وظیفہ بتاؤں جو جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے؟''

(توانہوں نے کہا جی ضرور۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ یہ ہے:)

((لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)) .

''کسی کام کے کرنے کی طاقت اور کسی چیز سے بچنے کی قوت اللہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں''۔ [(۱)]

۲۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے سنا ہے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اے اللہ! جو تو دینا چاہے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روکنا چاہے اسے کوئی دینے والا نہیں اور تیرے سامنے کسی بڑے کی بڑائی (یا دولت والے کی دولت) اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی''۔ [(۲)]

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

((يَا غُلَامُ! اِنِّيْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تَجَاهَكَ، اِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ اِنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب لا حول ولا قوة الا بالله، ح: ٦٦١٠۔

۲۔ بخاری، کتاب القدر، باب لا مانع لما اعطی الله، ح: ٦٦١٥۔

بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَضُرُّوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ))[1]

''اے لڑکے! میں تمہیں کچھ باتیں بتاتا ہوں (انہیں نوٹ کرلو) اللہ کو یاد رکھو، اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔ اللہ کو یاد رکھو گے تو تم (مشکل میں) اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب بھی سوال کرو، اللہ ہی سے کرو۔ اور جب بھی مدد مانگو، اللہ ہی سے مدد مانگو۔ اور یاد رکھو کہ اگر ساری امت کے لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا ہے تو وہ تمہیں صرف اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتے ہیں جو تمہارے نصیب میں (پہلے سے) لکھا ہوا ہے (اس سے زیادہ نہیں) اور اگر ساری امت کے لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا ہے تو وہ صرف اتنا ہی نقصان تمہیں پہنچا سکتے ہیں جو پہلے سے تمہارے مقدر میں لکھا ہے۔ (تقدیر لکھنے والے) قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے (جن میں تقدیر لکھی گئی ہے) خشک ہو چکے ہیں (یعنی اب ان میں مزید کچھ کمی بیشی نہ ہوگی)''۔

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْرًا اِسْتَعْمَلَهُ، فَقِیْلَ: كَیْفَ یَسْتَعْمِلُهُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: یُوَفِّقُهُ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ))[2]

''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے بھلائی کا ارداہ کرتے ہیں تو اسے اپنے کام میں لے آتے ہیں۔ پوچھا گیا وہ کیسے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ایسے کہ اللہ اسے موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دے دیتے ہیں''۔

۵۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرو:

((اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ))[3]

''یا اللہ! میری مدد فرما کہ میں تیرا ذکر اور شکر اور اچھی عبادت کرسکوں''۔

۱۔ ترمذی، کتاب صفة القیامة، باب حدیث حنظلة، ح ۲۵۱۶۔ مسند احمد، ج ۱ ص ۲۹۳۔

۲۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان الله کتب کتابا لاهل الجنة واهل النار، ح ۲۱۴۲۔

۳۔ ابو داؤد، کتاب الصلوٰة، باب فی الاستغفار، ح ۱۵۲۲۔ نسائی، کتاب السهو۔ احمد، ج ۵ ص ۲۴۵۔

تشریح

ان احادیث میں اللہ کی قوت وشوکت کا بیان ہے۔ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی توفیق ہی سے انسان اپنے کام کرتا ہے اور اسی کی مدد سے وہ برائی اور نقصان سے بچتا ہے۔یعنی اگر اللہ ایک کام نہ چاہے تو انسان اپنی انسانی طاقت سے وہ کام نہیں کرسکتا خواہ اس کی مدد کو ساری کائنات ہی کیوں نہ جمع ہو جائے۔اور ایک کام اگر اللہ چاہے تو انسان اپنی انسانی طاقت سے اسے روک نہیں سکتا۔گویا انسان اللہ کے ساتھ نہ کسی کام کے کرنے پر مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ کسی کام کے روکنے پر۔اس لیے انسان کو ہمیشہ اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔کبھی اپنے اندر سرکشی اور انانیت نہیں آنے دینا چاہیے یعنی کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ 'میں' بڑی چیز ہوں، یا 'میں' جو چاہوں کرسکتا ہوں۔یہ 'میں' کا لفظ اور سوچ اللہ کی کبریائی کو گویا چیلنج کرنے والی بات ہے،معاذ اللہ!

بری تقدیر پر صبر کرنا چاہیے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كَانَ عَذَابًا يَبْعَثُهُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ فَجَعَلَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، مَا مِنْ عَبْدٍ يَكُوْنُ فِيْ بَلَدٍ يَكُوْنُ فِيْهِ وَيَمْكُثُ فِيْهِ لَا يَخْرُجُ مِنَ الْبَلَدِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا يُصِيْبُهُ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ اِلَّا كَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِ شَهِيْدٍ))[1]

''یہ ایک عذاب تھا اور اللہ جس پر چاہتا یہ عذاب نازل کرتا، پھر اللہ نے اسے مومنوں کے لیے رحمت بنا دیا۔کوئی شخص اگر کسی ایسے شہر میں ہو جہاں طاعون کی وبا پھوٹی ہو اور وہ وہیں ٹھہرا رہے اور اس شہر سے بھاگے نہیں بلکہ صبر کیے رہے اور اللہ سے اجر کی امید رکھے اور یہ یقین رکھے کہ اسے وہی پہنچے گا جو اللہ نے اس کی تقدیر میں لکھ رکھا ہے تو اس شخص کو شہید کے برابر اجر ملے گا''۔(بشرطیکہ وہ طاعون کی بیماری سے فوت ہو)

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب: قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا، ح ۶۶۱۹۔

تشریح

اس حدیث میں ایک تو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انسان کو جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ صرف وہی ہوتی ہے جو پہلے سے اس کے مقدر میں لکھی ہے اور وہ لازماً اسے پہنچ کر رہتی ہے، خواہ اس سے بچنے کے انسان لاکھ حیلے کر لے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اس مصیبت پر انسان کو صبر کرنا چاہیے۔ انسان کی دنیوی واخروی بہتری اسی میں ہے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جہاں طاعون کی وبا پھیلی ہو، وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طاعون کی وبا سے بچاؤ کے لیے علاج اور احتیاط کے اسباب اختیار نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ علاج معالجہ اور دیگر اسباب اختیار کرنے کی دیگر احادیث میں بڑی تاکید کی گئی ہے اور اسے بھی تقدیر کا حصہ ہی قرار دیا گیا ہے۔

یہاں طاعون والے علاقے سے نہ نکلنے کی بات اس لیے کی گئی ہے کہ طاعون ایک متعدی وبا ہے اور ظاہر ہے جب اس وبا کے شکار لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگیں گے تو جو علاقے اس وبا سے خالی ہیں، وہاں بھی اس کے اثرات پہنچیں گے اور دوسرا یہ کہ اس سے ایک مسلمان معاشرے میں عجیب ابتری کی کیفیت پیدا ہوگی اور صاف نظر آئے گا کہ ان لوگوں کا اللہ، آخرت اور تقدیر پر شاید ایمان نہیں ہے جو یوں موت کے خوف سے اتنا پریشان ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر موت کا وقت اور سبب تقدیر میں پہلے سے مقدر ہے تو اس کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے، اسی لیے مصیبت و پریشانی کی حالت میں خودکشی کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔

تقدیر پر راضی رہنا چاہیے

((عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ))[1]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جتنی آزمائش بڑی ہوتی ہے اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے محبت کرتے ہیں تو انہیں آزماتے ہیں۔ پس جو تو

۱۔ ترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی الصبر علی البلاء۔ السلسلة الصحيحة، ج ۱ ص ۲۲۷۔

(اللہ کی آزمائش پر) راضی رہا، اس کے لیے (اللہ کی طرف سے بھی) رضا ہے اور جو ناراض ہوا، اس کے لیے (اللہ کی طرف سے) ناراضگی ہے‘‘۔

تشریح

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو کسی مصیبت میں مبتلا کریں، یا فقر و غربت سے واسطہ ڈال دیں یا کسی بیماری میں مبتلا کر دیں یا جسمانی طور پر کوئی نقص پیدا کر دیں تو ایسی تمام صورتوں میں انسان کو چاہیے کہ اللہ کی طرف سے کیے گئے تقدیر کے اس فیصلہ کو اللہ کی مشیت سمجھ کر قبول کرے اور اس پر اللہ سے شکوہ کرنے کی بجائے صبر کرے۔ صبر کرنے سے اللہ کی رضا حاصل ہوگی اور صبر نہ کرنے پر اس اللہ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا اور ہر وقت اپنی مصیبت پر افسوس اور غم کرتے رہنے سے کئی ایک جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں بھی اسے گھیر لیں گی اور وہ مصیبت بھی اس طرح غم کرنے سے دور نہیں ہوگی۔

نقصان ہو جانے کے بعد حسرت اور افسوس کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اگر میں یہ کرتا یا اگر میں یہ نہ کرتا تو نقصان نہ ہوتا......

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ قَدَرُ اللّٰهِ وَمَا شَاءَ اللّٰهُ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))[1]

’’اللہ کے نزدیک طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر اور پسندیدہ ہے، اور اگرچہ دونوں ہی کے لیے خیر ہے۔ تم اس چیز کی حرص کرو جو تمہیں فائدہ پہنچائے اور اللہ سے مدد مانگو، اور کبھی عاجز آ کر بیٹھ نہ جاؤ۔ اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو (اس کے بعد حسرت اور افسوس سے) یہ نہ کہو: اگر میں یہ کر لیتا تو یہ اس طرح ہوتا یا (یہ نہ کرتا تو) یہ اس طرح ہوتا۔ بلکہ (نقصان کے بعد) یہ کہو کہ جو اللہ نے مقدر میں لکھا تھا اور جو اس کی مشیت تھی، وہی اس نے کیا۔ کیونکہ 'اگر' کا لفظ شیطان کے عمل کا راستہ کھولتا ہے‘‘۔

۱۔ مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان له، ح ۲٦٦٤۔

تشریح

اس حدیث میں بھی تقدیر میں لکھے برے پر صبر کی تلقین کی گئی ہے۔انسان کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ نقصان ہو جانے کے بعد اس پر حسرت اور افسوس ہی کرتے رہنا اور جن اسباب کی وجہ سے نقصان ہو گیا ہے، ان کے بارے میں اس طرح سے سوچتے رہنا کہ..... ''اگر میں یہ نہ کرتا تو یہ نقصان نہ ہوتا'' ..... ''اگر میں فلاں کام کر لیتا تو اس نقصان سے بچ جاتا'' ..... یہ رویہ انسان کو مزید مایوس بناتا ہے اور اسلام میں مایوسی کو سخت ناپسند کیا گیا ہے۔

نقصان ہو جانے کے بعد درست رویہ یہ ہے کہ

۱۔اس نقصان پر یہ سوچ کر صبر کر لیا جائے کہ یہ تقدیر میں لکھا تھا اور ایسا ہو کر رہنا تھا۔

۲۔جن اسباب کی وجہ سے نقصان ہوا، آئندہ کے لیے ان سے محتاط ہو جانا چاہیے کیونکہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا تقدیر کے منافی نہیں اور مومن تو ہوتا ہی وہ ہے جو ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

۳۔جس سبب سے نقصان ہوا، اس کے بارے میں بھی یہی بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس نقصان کا یہ سبب بھی تقدیر میں لکھا تھا، اس لیے جن حالت یا جن لوگوں کی وجہ سے وہ سبب پیدا ہوا، اگر اس میں ان کی مجرمانہ غفلت یا غلط اور مذموم کوشش شامل نہیں ہے، تو انہیں برا بھلا کہنے کی بجائے صبر ہی کا کڑوا گھونٹ پی لینا چاہیے۔

۴۔اگر کسی نقصان میں کسی شخص کی مجرمانہ غفلت شامل ہے اور عرف ورواج کے مطابق وہ سزا یا سرزنش کا مستحق قرار پاتا ہے تو اسے وہ سزا دی جا سکتی اور اس کی سرزنش کی جا سکتی ہے۔کیونکہ ایسی صورتوں میں اسلام بھی سزا اور سرزنش کا قائل ہے۔اگر یہ بات نہ ہو تو پھر کسی بھی مجرم کو کسی بھی جرم پر سزا دینے کا نظام سرے سے غلط قرار پائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔اور اگر اسے اس طرح مان لیا جائے تو پھر معاشرے میں بدامنی ہی ہوگی، امن وامان کبھی قائم نہ ہو پائے گا۔مجرم بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دے گا کہ میری قسمت میں یہ جرم لکھا تھا، اس لیے میں نے کیا ہے، مجھے سزا کیوں دیتے ہوں!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے روایات میں آتا ہے کہ ایک مجرم نے جرم کے بعد ان کے سامنے تقدیر کا ایسا ہی بہانہ تراشا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس کے جرم کی سزا کا بھی حکم دیا اور ساتھ جلاد کو یہ بھی حکم دیا کہ اسے اس بات پر کوڑے لگائے جو اس نے تقدیر کا بہانہ بنا کر اللہ پر جھوٹ بولا ہے۔

کیا دعا یا صلہ رحمی وغیرہ سے تقدیر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے؟

۱۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ))[۱]

''کوئی چیز تقدیر کو ٹالتی نہیں سوائے دعا کے اور نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے''۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَاَنْ يُنْسَاَ لَهُ فِيْ اَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ))[۲]

''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی کی جائے اور اس کے نشان قدم (باقی رکھنے میں) طوالت دی جائے (یعنی عمر میں اضافہ (یا بقولِ بعض) برکت دی جائے) تو اسے چاہیے کہ اپنی رشتہ داری کو ملائے''۔

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْاَهْلِ مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ مَنْسَاَةٌ فِي الْاَثَرِ))[۳]

''بے شک رشتہ داری ملانا گھر والوں میں محبت کا اور مال میں ثروت کا اور عمر میں اضافہ کا سبب ہے''۔

۴۔ ایک حدیث میں ہے:

((صِلَةُ الرَّحِمِ تَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ))[٤]

''رشتہ داری ملانے سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے''۔

۵۔ ایک اور حدیث میں ہے:

''آدمی گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اور صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے''۔[۵]

۱۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء لا یرد القدر الا الدعاء، ح ۲۱۳۹۔

۲۔ بخاری، کتاب الادب، باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم، ح ۵۹۸۵۔

۳۔ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی تعلیم النسب، ح ۱۹۷۹۔ صحیح الترمذی، ح ۱۶۰۲۔

٤۔ صحیح الجامع الصغیر، للالبانی، ح ۳۷۶۶۔ السلسلة الصحیحة، ح ۱۹۰۸۔

۵۔ مسند احمد، ج ۵ ص ۲۲۷۔

تشریح

بعض علمائے اہل سنت نے تقدیر اور قضا کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے؛ ایک کو قضائے مبرم کہا جاتا ہے اور دوسری کو قضائے معلق۔

قضائے مبرم سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ اللہ کے پاس ہے۔ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ یہی تقدیر ہے اور کسی انسان، فرشتے یا جن کی اس تک رسائی نہیں ہے، یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

قضائے معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں مختلف اسباب کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور جن احادیث میں تقدیر میں تبدیلی کے بارے میں کوئی بات بیان ہوئی ہے، اس سے مراد یہی قضائے معلق ہے جس میں مختلف اسباب کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ بعض اہل علم ان احادیث سے حقیقی تبدیلی مراد لینے کی بجائے روحانی اثر اور برکت مراد لیتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر میں جو بات سمجھ نہ آئے اس میں بحث نہیں کرنی چاہیے

ا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰی احْمَرَّ وَجْهُهٗ حَتّٰی کَاَنَّمَا فُقِیءَ فِیْ وَجْنَتَیْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَیْکُمْ؟ اِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ حِیْنَ تَنَازَعُوْا فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ اَلَّا تَنَازَعُوْا فِیْهِ))(۱)

''ایک مرتبہ ہم قضا وقدر کے مسئلہ پر بحث اور جھگڑا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے (اور ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) آپ کا چہرہ مبارک غصہ سے اس طرح سرخ ہو گیا کہ جیسے (سرخ) انار کے دانے آپ کے چہرے پر نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کیا میں اسی لیے رسول بنا کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں؟! یاد رکھو کہ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک کی گئیں کہ انہوں نے اس تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمہیں بڑی تاکید کے ساتھ اور پھر تاکید کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ تم تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ نہ کرنا''۔(۱)

---

(۱) ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء فی التشدید فی الخوض فی القدر، ح ۲۱۳۳۔ ابن ماجہ، ح ۸۵۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

''میں اور میرا بھائی ایک ایسی مجلس میں بیٹھے تھے جو ہمیں سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند تھی۔ ہوا یوں کہ میں اور میرا بھائی (نبی کریم ﷺ سے ملنے کے لیے) آئے تو ہم نے دیکھا کہ کچھ کبار صحابہ نبی کریم ﷺ کے دروازے کے پاس بیٹھے ہیں۔ ہم نے ناپسند کیا کہ ان کے درمیان جا بیٹھیں، چنانچہ ہم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ان صحابہ نے قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھی پھر اس میں ان کا جھگڑا شروع ہو گیا حتی کہ اس جھگڑے میں ان کی آوازیں بہت بلند ہو گئیں۔ ادھر نبی کریم ﷺ بھی گھر سے باہر تشریف لے آئے، آپ غصہ میں تھے حتی کہ غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہوئے جا رہا تھا اور آپ ان پر مٹی پھینکتے ہوئے فرمانے لگے: لوگو! باز آ جاؤ، تم سے پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے نبیوں سے اختلاف شروع کر دیا اور اللہ کی کتاب کے بعض حصوں کو بعض کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا۔ بے شک قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو جھٹلاتا ہو بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے، پس تمہیں اس سے جو سمجھ آئے اس پر عمل کرو اور جس کی سمجھ نہ آئے وہ اس کتاب کے عالم کی طرف لوٹا دو''۔ (۱)

تشریح

اس حدیث میں مسئلہ تقدیر کے حوالے سے جس چیز پر نبی کریم ﷺ نے غصہ فرمایا اور اس سے منع فرمایا وہ یہ ہے کہ لوگ اس مسئلہ میں جھگڑا اور مناظرہ و مباحثہ نہ کریں۔ اس لیے کہ مسئلہ تقدیر کے بعض پہلو انسانی عقل وفہم سے بالا ہیں، لہٰذا انسان کو اس مسئلہ کے ان پہلوؤں کے بارے میں سوچ و بچار اور بحث و مباحثہ نہیں کرنا چاہیے جو اس کی عقل سے اللہ نے ماورا رکھے ہیں اور جتنا قرآن وسنت میں اس مسئلہ کے بارے میں صاف صاف بتا دیا ہے، اس پر ایمان رکھنا چاہیے۔

......☆......

۱۔ مسند احمد، ح ۶۷۰۳۔ و رواہ مسلم مختصراً۔ شیخ احمد شاکرؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

باب ۴

تقدیر کے بارے میں پائے جانے والے شبہات اور ان کا اِزالہ

تقدیر کے بارے میں شبہات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

تقدیر کا مسئلہ اگر انسانی فہم سے بالا ہے تو اس پر بحث کیوں کی جاتی ہے؟

سب کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا تو پھر عمل اور محنت کی کیا ضرورت؟

تقدیر اور اسباب کا باہمی تعلق کیا ہے؟

کیا انسان اپنی تقدیر اور قسمت بدل سکتا ہے؟

تقدیر اور ہدایت و گمراہی کا باہمی تعلق کیا ہے؟

کیا اللہ ہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے؟

......☆......

فصل ۱

تقدیر کے بارے میں شبہات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

۱۔ اللہ کی صفات کے بارے کم علمی

تقدیر کے بارے میں جو مختلف شبہات پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک وجہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں صحیح علم نہ ہونا ہے مثلاً جبریہ فرقہ نے تقدیر کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ انسان مجبور محض ہے اور اسے کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ ہر کام اللہ ہی کی مشیت اور قدرت و طاقت کے بل بوتے پر ہوتا ہے۔ یہ رائے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے متعلقہ آیات سے اخذ کی جو اللہ کی مشیت عامہ اور قدرت مطلقہ پر دلالت کرتی ہیں۔ حالانکہ اللہ کی مشیت عامہ اور قدرت مطلقہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ نے انسان کو دنیا میں کوئی اختیار نہیں دیا۔ ورنہ کیا اللہ تعالیٰ معاذ اللہ ظالم تھے کہ ایک انسان کو جہنم میں اس بات پر ڈال دیں کہ اس نے اللہ کے احکام پر عمل نہیں کیا جبکہ اسے ان احکام پر عمل کرنے کا اختیار بھی نہ دیا ہو بلکہ مجبور محض بنایا ہوا اور جب وہ پہلے ہی اللہ کی طرف سے مجبور محض تھا تو پھر اسے سزا کس بات کی؟!

اسی طرح قدریہ نے اللہ کی صفات کے سلسلہ میں دوسرے پہلو کو پیش نظر رکھا، وہ یہ کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے، بالخصوص شر اور برائی، یہ سب وہ اس حد تک اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ کرتا ہے کہ ان کاموں کے پیچھے نہ اللہ کا ارادہ شامل ہوتا ہے اور نہ اس کی مشیت۔ بلکہ ان افعال کا خالق بھی بندہ خود ہی ہوتا ہے۔ اللہ نے نہ شر اور برائی کو پسند کیا ہے اور نہ اسے پیدا کیا اور نہ ہی انسان سے اس کا صدور اس کی مشیئت یا ارادے کے ماتحت ہوتا ہے، بلکہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے عمل سے اسے پیدا کرتا ہے، گویا انسان اپنے برے عمل کا فاعل بھی خود ہے اور خالق بھی خود ہی۔

حالانکہ قدریہ کے اس موقف سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاذ اللہ دنیا میں اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے اور یہ کہ شر اور برائی کے پیچھے اللہ کی مشیت نہیں ہوتی تو بندہ اللہ کی مشیت اور ارادے کے برخلاف ایک عمل کرتا ہے اور اللہ اسے اس عمل پر روکنے سے مجبور ہوتا ہے۔ اس سے تو اللہ کی قدرت و طاقت پر حرف آتا ہے؟!

۲۔انسانی اختیار کے بارے میں غلط فہمی

تقدیر کے بارے میں شبہات پیدا ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان خود انسانی اختیار کو سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔کبھی تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے تقدیر کے سلسلہ میں ہر طرح کا اختیار دے دیا گیا ہے اور کبھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ تقدیر کے آگے بالکل مجبور اور بے بس ہے۔حالانکہ حقیقت ان دونوں چیزوں کے درمیان ہے۔وہ یہ کہ انسان کو ایک حد تک اختیار بھی دیا گیا ہے اور ایک حد تک وہ مجبور بھی ہے۔

اختیار اسے یہ دیا گیا ہے کہ وہ اگر کھانا کھانا چاہے، پانی پینا چاہے، سفر کرنا چاہے، بات کرنا چاہے، یا کوئی بھی اور عمل کرنا چاہے تو کوئی طاقت زبردستی اسے روکتی نہیں ہے اور اگر وہ کوئی عمل نہ کرنا چاہے تو کوئی طاقت زبردستی اسے اس کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔اسی طرح اس کا ارادہ واختیار اور آزادیِ عمل اس حد تک ہے کہ اگر وہ دائیں طرف چلنے کا ارادہ کرے تو کوئی طاقت زبردستی اسے بائیں طرف نہیں پھیرتی، اور اگر وہ بائیں طرف چلنے پر مصر ہو تو کوئی طاقت اسے دائیں نہیں گھماتی۔اگر وہ منہ میں نوالا ڈالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو کوئی طاقت اس کا ہاتھ منہ کی بجائے پاؤں کی طرف نہیں لے جاتی اور اگر وہ پاؤں پر ہاتھ لگانا چاہے تو کوئی طاقت اس کا ہاتھ زبردستی سر کی طرف نہیں پھیرتی۔

جہاں تک تقدیر کے ہاتھوں انسان کے مجبور اور بے بس ہو جانے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں اول تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس بنیاد پر انسان عمل چھوڑ کر بیٹھ جائے اور اسی پر افسوس کیے جائے کہ تقدیر ہمیں کچھ کرنے نہیں دیتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے کچھ اصولوں پر قائم کیا ہے اور عام طور پر وہ اصول اس کائنات میں جاری وساری رہتے ہیں۔اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان اصولوں سے ہٹ کر کوئی چیز دنیا میں رونما ہو۔اگر ایسا ہو تو اسے معجزہ، کرامت یا اللہ کی قدرت کا اظہار کہا جاتا ہے۔کچھ اسی طرح کا قانون ہمیں تقدیر کے بارے میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔عام طور پر انسان جس چیز کے حصول کے لیے محنت اور تگ ودو کرتا ہے، وہ اسے اپنی محنت کے بقدر پا ہی لیتا ہے مگر ایسا بھی بعض اوقات ہوتا ہے کہ انسان اپنی انسانی طاقت کی حد تک سب کچھ کر گزرتا ہے مگر وہ اس چیز کے حصول سے محروم ہی رہتا ہے اور پھر خود ہی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر انسانی طاقت سے اس چیز کا حصول ممکن ہوتا

تو میں کم از کم اس سے محروم نہ رہتا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی قدرت یہاں انسانی اختیار کے آگے رکاوٹ بن جاتی ہے یا یہ کہ اس چیز کا حصول اللہ کی مشیت نہیں ہوتی، اس لیے اس تک ساری کوششوں کے باوجود رسائی ممکن نہیں ہو پاتی۔ اگر چہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا، تاہم انسان کی زندگی میں اس طرح کے مواقع کئی مرتبہ پیدا ضرور ہوتے ہیں اور شاید یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ یہ انسان کو اللہ کی مشیئت، ارادہ اور قدرت وطاقت پر ایمان لانے اور اس کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرے۔ انسان اللہ کی عظمت اور قدرت سے غافل نہ ہو اور ہمیشہ اسی کے آگے اپنی بہتری اور نیک خواہشات کی تکمیل کے لیے دعا گو رہے۔ لیکن بعض لوگ اسی چیز کو اپنی سستی اور کوتاہی کی دلیل اور عمل کی راہ سے جی چرانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔

۳۔ نصوص (آیات واحادیث) کو سمجھنے میں غلط فہمی

تقدیر کے بارے میں شبہات پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کے بارے میں وارد شدہ آیات واحادیث کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر سمجھنے اور ان میں تطبیق پیدا کرنے کی بجائے انہیں علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے اس طرح ان میں یا تو تضاد اور ٹکراؤ دکھائی دیتا ہے یا پھر ایک ہی رخ غالب دکھائی دیتا ہے۔ جبریہ کو جبر کا رخ دکھائی دیا کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں کلی طور پر مجبور ہے اور قدریہ کو یہ رخ غالب نظر آیا کہ تقدیر کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ انسان خود ہی سب کچھ کرتا ہے۔

اہل سنت کا نقطہ نظر ان دونوں کے مابین اعتدال پر مبنی ہے، اس لیے کہ اہل سنت تقدیر کے بارے میں وارد شدہ تمام نصوص (یعنی آیات واحادیث) میں تطبیق دیتے اور سبھی نصوص پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ کسی صحیح حدیث کو رد کرتے ہیں اور نہ کسی آیت کی دور از کار تاویل کرتے ہیں۔

......☆......

فصل ۲

تقدیر کے بارے میں پائے جانے والے چند بڑے شبہات

ا۔ تقدیر کا مسئلہ اگر انسانی فہم سے بالا ہے تو اس پر بحث کیوں کی جاتی ہے؟

تقدیر کے بارے میں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ اللہ کا مخفی راز ہے اور انس و جن و ملائکہ میں سے کوئی بھی اس کی حقیقت نہیں جانتا اور نہ ہی انسانی فہم اس کی گہرائی تک جا سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک طرف اسے نہایت درجہ اہمیت دیتے ہوئے ایمانیات (ارکان ایمان) میں جگہ دی گئی ہے اور دوسری طرف بعض ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں مسئلہ تقدیر پر غور و خوض سے صاف منع بھی کیا گیا ہے۔ اگر اسے سمجھنا ممکن ہی نہیں تو پھر علماء ہمیشہ سے اس کے بارے میں کتابیں کیوں لکھتے رہے؟ اس مسئلہ کو دینیات میں پڑھا اور پڑھایا کیوں جاتا رہا ہے؟! اس پر بحث و مباحثے کیوں کیے جاتے رہے؟؟!

جواب

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض احادیث میں مسئلہ تقدیر میں غور و خوض سے منع کیا گیا ہے تو یقیناً ایسی احادیث موجود ہیں۔ ہم پہلے ان احادیث کو ذیل میں درج کرتے ہیں، پھر اس کے بعد انہی احادیث کے سیاق و سباق کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیں گے۔

ا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((خَرَجَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّمَا فُقِىءَ فِي وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ؟ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِينَ تَنَازَعُوا فِي هٰذَا الْأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَلَّا تَنَازَعُوا فِيهِ))

"ایک مرتبہ ہم قضا و قدر کے مسئلہ پر بحث اور جھگڑا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے (اور

ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) آپ ﷺ کا چہرہ مبارک غصہ سے اس طرح سرخ ہو گیا کہ جیسے (سرخ) انار کے دانے آپ کے چہرے پر نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کیا میں اسی لیے رسول بنا کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں؟! یاد رکھو کہ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک کی گئیں کہ انہوں نے اس تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمہیں بڑی تاکید کے ساتھ اور پھر تاکید کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ تم تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ (جھگڑا) نہ کرنا''۔ [۱]

اس حدیث میں مسئلہ تقدیر کے حوالے سے جس چیز پر نبی کریم ﷺ نے غصہ فرمایا اور اس سے منع فرمایا وہ یہ ہے کہ لوگ اس مسئلہ میں جھگڑا اور مناظرہ ومباحثہ نہ کریں۔

۲۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے یہ روایت زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ

''میں اور میرا بھائی ایک ایسی مجلس میں بیٹھے تھے جو ہمیں سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند تھی۔ ہوا یوں کہ میں اور میرا بھائی (نبی کریم ﷺ سے ملنے کے لیے) آئے تو ہم نے دیکھا کہ کچھ کبار صحابہ نبی کریم ﷺ کے دروازے کے پاس بیٹھے ہیں۔ ہم نے ناپسند کیا کہ ان کے درمیان جا بیٹھیں، چنانچہ ہم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ان صحابہ نے قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھی پھر اس میں ان کا جھگڑا شروع ہو گیا حتی کہ اسی جھگڑے میں ان کی آوازیں بہت بلند ہو گئیں۔ ادھر نبی کریم ﷺ بھی گھر سے باہر تشریف لے آئے، آپ غصہ میں تھے حتی کہ غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہوئے جا رہا تھا اور آپ ان پر مٹی پھینکتے ہوئے فرمانے لگے: لوگو! باز آ جاؤ، تم سے پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے نبیوں سے اختلاف شروع کر دیا اور اللہ کی کتاب کے بعض حصوں کو بعض کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا۔ بے شک قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو جھٹلاتا ہو بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے، پس تمہیں اس سے جو سمجھ آئے اس پر عمل کرو اور جس کی سمجھ نہ آئے وہ اس کتاب کے عالم کی طرف لوٹا دو''۔ [۲]

۱۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء فی التشدید فی الخوض فی القدر، ح۲۱۳۳۔

۲۔ مسند احمد، ح۶۷۰۳، وہ اسنادہ مختصرا۔ شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے یہی واضح ہو رہا ہے کہ تقدیر کے مسئلہ میں مناظرہ بازی سے منع کیا گیا ہے اور علمائے اہل سنت کا شروع سے یہی عمل رہا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں جدل و مناظرہ کو ناپسند کرتے ہیں۔

اسی طرح مسئلہ تقدیر میں دوسری چیز جسے اہل علم نے ان احادیث کی بنیاد پر قابل مذمت قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور یہ مسئلہ انسانی عقل وفہم سے بالا ہے، لہٰذا انسان کو اس مسئلہ کے ان پہلوؤں کے بارے میں سوچ و بچار اور بحث ومباحثہ نہیں کرنا چاہیے جو اس کی عقل سے اللہ نے ماورار کھے ہیں۔

جہاں تک مسئلہ تقدیر کے ان پہلوؤں کا تعلق ہے جو قرآن وسنت میں واضح انداز میں بیان کئے گئے ہیں اور انہیں ایمانیات کا حصہ قرار دیا گیا ہے تو ان پر اس حد تک ایمان لانا ضروری ہے جس حد تک ان پر ایمان لانے کا دین میں مطالبہ کیا گیا ہے مثلاً یہ ایمان کہ ہر چیز کی تقدیر اللہ نے پہلے سے لکھ رکھی ہے۔ دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے سب اللہ کے اَزلی علم میں موجود ہے اور اس کے ہاں لوحِ محفوظ میں مرقوم ہے۔

ظاہر ہے مسئلہ تقدیر کا یہ پہلو بھی عوام الناس کو اسی طرح ذہن نشین کرانا ضروری ہے جس طرح ایمان کے دوسرے ارکان کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں تقدیر کے مسئلہ میں چونکہ شروع سے عجیب وغریب نظریات چلے آرہے ہیں اور عہد صحابہ میں بھی بعض لوگوں نے ایسے شبہات کا اظہار کیا اور کبار صحابہ نے ان کا تشفی بخش جواب دیا، اس لیے تقدیر کے سلسلہ میں جہاں ایسے شبہات پائے جائیں، وہاں اہل علم کا یہ منصب ہے کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان شبہات کا ازالہ کریں اور اپنی تحریر وتقریر ہر ممکنہ ذریعے سے اس ذمہ داری کو پورا کریں۔

یہاں اسی موضوع کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تقدیر کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور گنجلک ہے کہ بعض اوقات ایک عالم اور سمجھ دار آدمی بھی چکر کر رہ جاتا ہے۔ بالخصوص جب اس مسئلہ کو تفصیل سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں سلامتی کی راہ یہی ہے کہ بندہ اس موقف پر اپنے آپ کو قائم رکھے جو **اهل السنة والجماعة** کا ہے کیونکہ اہل سنت نے اس مسئلہ کے بارے میں ہر اس پہلو پر سکوت اور توقف کی تلقین کی ہے جہاں انسان کی عقل وفہم کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ سکوت وتوقف نہ کیا جائے تو شاید قرآن وسنت کے کئی ایک نصوص کے بارے میں انسان شک وشبہ میں پڑ جائے اور پھر اپنی تقدیر کے سلسلہ میں بھی کئی جگہ شاید اسے اللہ سے شاکی بننا پڑے۔

معاذ الله من ذلك!

۲۔ سب کچھ تقدیر میں لکھا جاچکا تو پھر عمل اور محنت کی کیا ضرورت؟

[تقدیر اور اسباب کا باہمی تعلق]

مسئلہ تقدیر کے بارے میں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے تو پھر کسی چیز کے حصول کے لیے کوشش کرنے اور مادی اسباب اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟! اگر ایک چیز نصیب میں ہے تو وہ محنت اور کوشش کے بغیر بھی مل جائے گی اور اگر وہ نصیب میں نہیں تو پھر محنت کے باوجود بھی نہیں ملے گی تو خوامخواہ سرکھپائی اور بھاگ دوڑ کیوں کی جائے۔

جواب

یہ شبہ قرآن وسنت کے ان نصوص (دلائل) سے پیدا ہوتا ہے جن میں واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر پہلے سے لکھ دی ہے حتی کہ انسان کی موت، رزق، وسائل، مصائب و آلام، مرض، صحت سب کچھ پہلے سے لکھا جاچکا ہے اور اسی طرح یہ اپنے وقت پر دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے بارے میں ہر طرح کا علم تھا مثلاً ہر انسان کے بارے میں اللہ کو پہلے سے علم تھا کہ وہ دنیا میں کب اور کیسے پیدا کیا جائے گا، اس کی زندگی کتنی ہوگی، کتنے وسائلِ رزق اسے دیئے جائیں گے اور کس طرح دیئے جائیں گے، اس کی زندگی میں اس پر کیا کیا خوشی اور غمی آئے گی اور کب اور کس طرح آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر پہلے سے ایک اندازہ لگا لیا تھا اور اسے لوح محفوظ میں لکھ بھی دیا اور ظاہر ہے اللہ کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوسکتا اور نہ اللہ کا علم غلطی کرسکتا ہے۔ ایک انسان اور اس کے پیدا کرنے والے میں یہی فرق ہے کہ مخلوق کا اندازہ اور علم غلطی کرسکتا ہے مگر خالق کا اندازہ اور علم کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔ اگر خالق کا علم و اندازہ بھی غلطی کر جائے تو پھر معاذ اللہ وہ خالق کس بات کا؟!

لیکن اللہ تعالیٰ نے اگر پہلے ہی سے اپنے علم و اندازے کے مطابق ایک چیز لکھ دی تھی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مخلوق کو بالجبر اسی لکھے ہوئے پر مجبور کیا جاتا ہے، اگر ایسے کسی جبر کا مسئلہ ہوتا تو ہمیں نہ ورنظر آ

جاتا۔ مگر ایسا کوئی جبر اور دباؤ ہم پر نہیں ہے بلکہ ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جو چاہیں عمل کریں۔ کوئی طاقت زبردستی ہمیں ہماری مرضی کے عمل سے روک نہیں دیتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ پہلے ہی تقدیر میں سب کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں!

بعض اہل علم اسے ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ کہ تقدیر کا لکھا ہوا تقریباً ایسے ہی ہے جیسے ایک استاد اپنے شاگردوں کا امتحان لینے سے پہلے ہی ان کے بارے میں جانتا اور ایک اندازہ رکھتا ہے کہ کون اس امتحان میں پاس ہوگا اور کون کون پاس نہیں ہو پائے گا۔ یہ اندازہ اسے اپنے شاگردوں کی پچھلی کارکردگی اور ان کی ذہانت اور عدم ذہانت کی وجہ سے ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے اس علم و اندازے کو کہیں لکھ بھی دے۔ اس کے بعد وہ ان کا امتحان لے اور امتحان کے بعد ٹھیک وہی اندازہ پورا ہو جائے کہ جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ یہ پاس نہ ہوگا، وہ پاس نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فلاں شاگرد اس لیے پاس نہ ہو سکا کہ استاد نے لکھ دیا تھا کہ یہ پاس نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی اس استاد کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کیا جاتا ہے کہ تم نے پہلے سے اس کے فیل ہونے کا اندازہ کیوں کر لیا تھا!!

جب مخلوق کی یہ مثال ہے کہ ایک ادنیٰ سا آدمی پیشگی اندازہ لگاتا ہے اور اس کا اندازہ اکثر و بیشتر پورا ٹھیک نکلتا ہے تو پھر خالق کے اندازے کی سمجھ آ جاتی ہے کہ اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں نکل سکتا۔ اور خالق کو پہلے ہی سے علم تھا کہ مخلوق میں سے کون کیا کرے گا اور اس نے یہ لکھ رکھا ہے اور اسی کا نام تقدیر ہے۔ اب کوئی انسان اس بات کو بہانہ بنا لے یا اس بنیاد پر اللہ سے شکوہ شروع کر دے کہ میری تقدیر میں ایسا کیوں لکھا گیا ہے تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق ہر انسان کے رزق، موت اور دیگر مادی چیزوں کے بارے میں سب کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے، اسی طرح اس نے اپنے علم ہی کی بنیاد پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کون کون جنت میں جائے گا اور کون کون جہنم میں۔ لیکن یہاں بھی انسان کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ چونکہ اللہ نے پہلے ہی میرے مقدر میں جنتی یا جہنمی ہونا لکھ دیا ہے تو میں عمل کیوں کروں، میں تو مجبور ہوں!

لوگ رزق کے سلسلہ میں تقدیر کا بہانہ نہیں بناتے!

یہی بہانہ انسان کسی بھی چیز کے بارے میں بنا سکتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر انسان نیکی اور برائی یا جنت اور جہنم کے مسئلہ میں صرف یہ بہانہ بناتا ہے ورنہ رزق وغیرہ کے سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ لوگ

تقدیر کا بہانہ کبھی نہیں بنائیں گے۔ کبھی آپ کو ایسا آدمی نظر نہیں آئے گا جو یہ کہہ کر گھر میں بیٹھ رہا ہو کہ میری قسمت میں روزی ہوگی تو گھر بیٹھے اور بغیر محنت کیے مجھے مل جائے گی۔ بلکہ روزی کے لیے انسان ہمیشہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور شاید بعض اوقات ضرورت سے زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے۔ ایک ماہ کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے تو ایک سال کی پلاننگ میں مصروف ہو جاتا ہے اور ایک سال کے لیے بندوبست ہو جائے تو دس سال کی سوچنے لگتا ہے!

مگر جب نماز روزے اور نیک عمل کی بات آتی ہے تو دنیاوی کاموں میں دن رات محنت کرنے والے فوراً عذر پیش کرنے لگیں گے: جی قسمت میں جنت میں جانا ہوا تو چلے ہی جائیں گے.....!

دراصل یہ شیطان کا دھوکا اور نفس کا وسوسہ ہے کہ انسان اپنی آخرت کے بارے میں بالکل غلط رخ پر سوچتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح وہ دنیا کے لیے حریص ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آخرت کے لیے حریص ہو۔ جس طرح دنیاوی مفادات کے لیے ہر طرح کے وسائل اور اسباب اختیار کرتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ آخرت کی بہتری کے لیے اسباب اختیار کرے، مگر شیطان کب چاہتا ہے کہ لوگ جنت میں جائیں، اس لیے وہ انسانوں کی آخرت تباہ کرنے کے لیے اس طرح کے الٹے پلٹے عذر اور بہانے انہیں سمجھاتا رہتا ہے!

رزق تقسیم ہے تو محنت کیوں؟ چرند پرند کی مثال

رزق کے سلسلہ میں عام طور پر انسان تقدیر کو بہانہ نہیں بناتا مگر بعض بے وقوف ایسے بھی ہیں جو اس مسئلہ میں بھی تقدیر کو بہانہ بنا لیتے ہیں کہ اللہ نے قسمت میں جو رزق لکھ رکھا ہے وہ ضرور مل کر رہے گا، خواہ محنت کریں یا نہ کریں۔

حالانکہ اللہ نے انسان کی قسمت میں جو رزق لکھا ہے اس کے اسباب بھی لکھے ہیں کہ اسے فلاں فلاں سبب سے فلاں فلاں چیز ملے گی۔ اب اگر کوئی سبب کو اختیار نہیں کرتا تو گویا اس کی قسمت میں وہ رزق لکھا ہی نہیں جو ان اسباب کو اختیار کرنے سے ملنا تھا جسے اس نے اختیار نہیں کیا۔

رزق کے سلسلہ میں انسان کو جانوروں اور پرندوں سے بھی سبق حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴾ [سورة هود: ٦]

''زمین میں چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں، سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں، وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اوران کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں موجود ہے''۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چرند پرند سبھی رزق کی تلاش میں کوشش کرتے ہیں اور سبب اختیار کرتے ہیں۔ پرندے بلاناغہ گھونسلوں سے نکلتے اور روزی تلاش کرتے ہیں۔ چیونٹی اپنی روزی کے سلسلہ میں جتنی محنت کرتی ہے، انسان غور کرے تو دنگ رہ جاتا ہے۔ بعض جانور اپنا بل بناتے اور بعض پرندے اپنا گھونسلا بنانے کے لیے جتنی دوڑ دھوپ کرتے ہیں، انسان عقل اسے دیکھ کر محوِتماشا رہ جاتی ہے۔ اب حیوانات تو اپنے رزق اور وسائل وغیرہ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کریں اور اشرف المخلوقات انسان تقدیر کا بہانہ بنا کر بیٹھا رہے تو کتنی بے وقوفی اور افسوس کی بات ہے!!

اَسباب کی اہمیت

نبی کریم ﷺ نے خود اسباب کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور انہیں اختیار کرنے کو تقدیر کے منافی نہیں بلکہ تقدیر ہی کا حصہ قرار دیا ہے مثلاً ایسی تمام احادیث جن میں نبی کریم ﷺ نے تقدیر کے حوالے سے کوئی ایسی بات بیان کی کہ سب کچھ پہلے سے لکھا جا چکا ہے حتیٰ کہ جہنمی اور جنتی ہونا بھی تقدیر میں لکھا جا چکا، قلم تقدیر لکھ کر خشک ہو چکا، وغیرہ وغیرہ تو اس پر صحابہ کو تردد ہوا اور انہوں نے یہ ضرور پوچھا کہ پھر ہمیں عمل کی کیا ضرورت؟!، چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا قَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ اَوْ مِنَ الْجَنَّةِ))

''تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانہ جنت یا جہنم میں لکھا جا چکا ہے''۔

تو لوگوں نے کہا:

((اَلَا نَتَّكِلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟))

''یارسول اللہ! پھر ہم اسی پر بھروسہ کر لیں؟'' (یعنی عمل چھوڑ دیں)

مگر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ نہیں کہا کہ ہاں عمل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ آپ نے ہمیشہ یہی کہا کہ

((لَا، اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ))

”نہیں، بلکہ عمل کرو کیونکہ ہر شخص (اپنی تقدیر کے مطابق) عمل کی آسانی دیا گیا ہے“۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ ایسے ہی ایک سوال پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((كُلٌّ يَّعْمَلُ لِمَا خُلِقَ لَهُ اَوْ لِمَا يُسِّرَ لَهُ))[2]

”ہر شخص وہی عمل کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے“۔

ایک اور حدیث میں ایسے ہی سوال کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَاِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ وَاِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ))[3]

”اپنے آپ کو (شریعت اور اچھے اعمال پر) قائم دائم رکھو اور (اس طرح اللہ کا) قرب تلاش کرو کیونکہ جو جنتی ہے اس کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے (موت سے پہلے) کیسے بھی عمل کیے ہوں اور جو جہنمی ہے اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ اس نے (موت سے پہلے) کیسے بھی عمل کیے ہوں“۔

گویا اچھے عمل جنت میں جانے کا سبب ہیں اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات بیان کی ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانے، وہ جنت میں جائے گا اور جو اس کے برخلاف کرے گا، اسے جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔ ایسی چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱)...... ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [سورة الفتح: ۱۷]

”جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا، اسے اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے (درختوں) تلے نہریں جاری ہیں اور جو کوئی منہ پھیر لے، اسے وہ دردناک عذاب (سزا) دے گا“

۱۔ بخاری، کتاب القدر، باب قوله: و كان امر الله قدرا مقدورا، ح ٦٦٠٥۔

۲۔ بخاری، ایضا، باب جف القلم علی علم الله، ح ٦٥٩٦۔

۳۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان الله کتب کتابا لاهل الجنة واهل النار، ح ٢١٤١۔ صحیح ترمذی، ج ٢، ص ٢٢٥۔

(۲)...... ﴿ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [سورة المومن: ٤٠]

''اور جس نے بھی نیکی کی، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان دار ہو تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں بے شمار روزی پائیں گے''۔

(۳)...... ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ [سورة النساء: ۱۲۲]

''جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ہم انہیں جنتوں میں لے جائیں گے جن کے نیچے چشمے جاری ہیں، وہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور کون ہے جو اپنی بات میں اللہ سے زیادہ سچا ہو!''۔

اب جو کوئی نیک عمل کرتا ہے وہ گویا جنت میں جانے کا سبب اختیار کرتا ہے اور جس کی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا، اس کی تقدیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جنت میں جانے کے لیے نیک عمل کی راہ اختیار کرے گا اور نیکی ہی پر مرے گا۔ اور جس کی تقدیر میں جہنم میں جانا لکھا ہے اس کے بارے میں یقیناً یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جہنمیوں والے عمل کرتے ہی مرے گا۔ اب اچھا یا برا عمل انسان کے اختیار میں ہے، وہ چاہے تو جنت میں جانے کے اسباب اپنا لے اور چاہے تو جہنم میں لے جانے والے ذرائع اختیار کر لے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کی قسمت میں اگر لکھا ہے کہ وہ صاحب اولاد ہوگا تو ظاہر ہے اس کا سبب بھی لکھا ہے کہ وہ شادی کرے گا اور پھر اسے اولاد کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ اگر کوئی یہ سوچ کر عمل و اسباب چھوڑ دے اور شادی نہ کرے کہ ہاں اگر قسمت میں اولاد ملنا مقدر ہوا تو پھر شادی نہ کر کے بھی اولاد مل کر رہے گی تو کیا اسے اولاد ملے گی؟!

ظاہر ہے ایسے شخص کو سب بے وقوف کہیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اسباب بھی مقدر کا حصہ ہوتے ہیں مگر نجانے کیوں عمل کی دنیا میں آ کر ہم فوراً یہ بات بھول جاتے ہیں۔

لمبی زندگی اور موت کے اسباب

بعض لوگ زندگی اور موت کے سلسلہ میں اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر پہلے سے موت کا وقت تقدیر میں طے شدہ ہے تو پھر خودکشی کرنے والا کیا اس وقت سے پہلے اپنے آپ کو مار لیتا ہے؟ اور کیا حفظانِ صحت کے اصولوں سے اس وقت میں اضافہ کر لینا بھی انسان کے اختیار میں ہوتا ہے؟؟

دراصل موت کے وقت مقررہ کے ساتھ اس کے اسباب بھی تقدیر میں لکھے ہوتے ہیں۔ یعنی اگر کسی کی موت خودکشی کے سبب آنی ہے تو وہ ایسے ہی آئے گی اور اسی وقت آئے گی جو پہلے سے تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اور اگر موت کا ابھی وقت نہیں آیا تو خودکشی کرنے والا خواہ جتنی مرضی کوشش کر لے، اس وقت سے پہلے وہ مر نہیں سکتا۔ ہم کئی مرتبہ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی مرنے کے لیے خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے مگر اس کے باوجود اللہ اسے بچا لیتا ہے، اس لیے کہ اللہ کے ہاں (یعنی تقدیر میں) ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔

اسی طرح حفظانِ صحت کے اصولوں کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر پہلے سے تقدیر میں لکھا ہے کہ ان اصولوں کے سبب سے کسی کی زندگی اس حد تک لمبی ہوگی تو پھر اللہ ہی اس شخص کو ان اسباب تک رسائی بھی دے دیتا ہے اور اگر اس کے برعکس کسی کی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ فلاں اسباب کے ساتھ یہ بیمار ہوگا اور فلاں وقت میں مرے گا تو انہی اسباب کے ساتھ اسے اسی وقت مقرر پر موت آئے گی۔ گویا اصل چیز تقدیر ہے اور اس کے ساتھ اسباب بھی اس کا حصہ ہیں۔ اسے درج ذیل حدیث سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

((عَنْ أَبِیْ عِزَّةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ إِذَا قَضَی اللّٰہُ لِعَبْدٍ أَنْ یَّمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَہٗ إِلَیْھَا حَاجَةً))[1]

''حضرت ابوعزۃ [یسار بن عبد رضی اللہ عنہ] سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کی تقدیر میں یہ لکھا ہو کہ یہ فلاں جگہ مرے گا تو اسے اس جگہ جانے کی کوئی ضرورت ڈال دیتے ہیں''۔

علاج معالجہ کے اسباب اختیار کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے

بعض لوگ علاج معالجہ کے سلسلہ میں بھی تقدیر کا بہانہ بناتے ہیں کہ اگر قسمت میں شفا لکھی ہوئی تو بغیر علاج کے مل جائے گی اور نہ لکھی ہوئی تو نہیں ملے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے مگر اسلام میں شفا کے حصول کے لیے علاج سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

١۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان النفس تموت حیث ما کتب لھا، ح ٢١٤٧۔

((قَالَتِ الْاَعْرَابُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! اَلَا نَتَدَاوٰی؟ قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ! تَدَاوَوْا، فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً اَوْ دَوَاءً اِلَّا دَاءً وَاحِدًا، فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا هُوَ؟ قَالَ اَلْهَرَمُ))

''کچھ دیہاتی لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا، اے اللہ کے رسول! کیا ہم دوا استعمال نہ کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ کے بندو! دوا استعمال کرو، بے شک اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس کی شفا اور دوا بھی ساتھ نہ اتاری ہو، سوائے ایک بیماری کے۔ انہوں نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ کون سی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ بڑھاپا ہے''۔ (۱)

نیز علاج معالجہ بھی تقدیر کا حصہ ہے، یہاں ہم ایک حدیث ذکر کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوگا کہ علاج معالجہ کے اسباب اختیار کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے۔

ابوخزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

((سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَاَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی بِهِ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قَالَ هِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ)) (۲)

''میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو ہم علاج کے لیے دوا استعمال کرتے ہیں اور دم جھاڑ وغیرہ کرواتے ہیں۔ کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر میں کوئی تبدیلی کرتی ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ چیزیں بھی تقدیر کا حصہ ہیں''۔

اسی طرح بعض لوگ بیماری سے بچاؤ کے لیے پیشگی تحفظات کو تقدیر کے منافی سمجھتے ہیں، حالانکہ جس طرح بیماری کے بعد اس کا علاج کرانا تقدیر کے منافی نہیں، اسی طرح بیماری سے پہلے اس سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا بھی تقدیر کے منافی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عہد صحابہ میں پیش آنے والا درج ذیل واقعہ بڑی واضح رہنمائی کرتا ہے:

۱۔ ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الدواء والحث علیه، ح۲۰۳۸۔

۲۔ ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرقی والادویة، ح۲۰۶۵۔ ایضاً، کتاب القدر، ح۲۱۴۹۔ مسند احمد، ج۳ص۴۲۱۔ حاکم: ج۴،ص۱۹۹۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ کو علم نہیں تھا اور آپ صحابہ کے ساتھ ملک شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی آپ کو ملے اور انہوں نے آپ کو بتایا کہ شام میں طاعون کی وبا پھوٹی ہوئی ہے۔ تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا واپس لوٹ جائیں۔ مشورے میں مختلف آراء سامنے آئیں، بالآخر آپ نے مدینہ واپس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ طاعون کی وبا سے محفوظ رہیں۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ صورتحال دیکھی تو وہ عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے:

((اَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ؟!))

''امیر المومنین! کیا اللہ کی تقدیر سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں؟!''

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ابوعبیدہ! کاش آپ یہ بات نہ کرتے۔ (مراد یہ تھی کہ ابوعبیدہ کو تقدیر کے سلسلہ میں صحیح فہم ہونا چاہیے تھا، کوئی کم فہم یہ بات کرتا تو پھر ٹھیک تھا کہ اسے اس مسئلہ کی سمجھ نہیں)

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ایک مثال دیتے ہوئے سمجھایا کہ بتائیے اگر آپ کے اونٹ ہوں اور آپ کے سامنے دو طرح کی زمینیں ہوں۔ ایک میں خوب اچھا چارہ ہو اور دوسری بنجر اور ویران ہو تو بتائیے آپ اگر اچھی چارے والی زمین میں جانوروں کو چراتے یا خشک اور بنجر زمین میں جانوروں کو چراتے تو دونوں صورتیں ہی تقدیر کا حصہ نہ ہوتیں؟

اسی دوران حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی آ گئے جو اپنے کسی کام کی وجہ سے کہیں ادھر ادھر تھے، انہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو کہنے لگے کہ اس سلسلہ میں مجھے علم ہے کیونکہ میں نے اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ

((اِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْهُ))

''اگر تم سنو کہ کسی جگہ طاعون کی وبا ہے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر تم کسی ایسی جگہ ہو جہاں طاعون کی وبا پیدا ہو جائے تو طاعون سے بچنے کے لیے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو''۔

یہ حدیث سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ (۱)

۱۔ بخاری، کتاب الطب، باب ما یذکر فی الطاعون، ح ۵۷۲۹۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اعتراض پر فرمایا:

((نعم، نفر من قدر الله الی قدر الله))

''ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ ہی کی تقدیر کی طرف جا رہے ہیں''۔

مطلب یہ تھا کہ یہاں سے واپس جانا بھی تقدیر کا حصہ ہے اور آگے جانا بھی تقدیر کا حصہ۔ ہم نے واپسی کی راہ کو اختیار کیا تاکہ اس سبب کے نتیجے میں ہماری وہ تقدیر بنے جس میں اس سبب کی وجہ سے ہم طاعون کی بیماری سے بچ جائیں گے اور اگر ہم آگے جانے کا سبب اختیار کرتے تو پھر ہم بھی طاعون کا شکار ہوتے اور دونوں صورتوں میں تقدیر کے مطابق ہوتا، لہٰذا ہم نے عافیت والے سبب کو اختیار کیا اور ہمارا ایسا کرنا بھی تقدیر کا حصہ ہے۔

دعا بھی تقدیر کا حصہ اور دیگر اسباب کی طرح ایک سبب ہے

بعض لوگ دعا کے بارے میں شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ تقدیر تو پہلے سے طے شدہ ہے پھر دعا سے کیا فائدہ؟ حالانکہ دعا بھی دیگر اسباب کی طرح ایک سبب ہے، بالکل اسی طرح جس طرح شادی اولاد کے حصول کے لیے سبب ہے، یا کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے، دوا صحت اور شفا کے حصول کا سبب ہے۔ لہٰذا جس طرح یہ اسباب نہیں چھوڑے جاتے اسی طرح دعا کے سبب کو بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ دعا کے بارے میں تو حکم ہے کہ دعا کی جائے اور احادیث میں ہے کہ جو شخص اللہ سے دعا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ناراض بھی ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ یَسْئَلِ اللّٰهَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ))[1]

''جو شخص اللہ سے دعا نہ کرے اللہ اس پر غصہ کرتے ہیں''۔

بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ دیگر اسباب کے مقابلہ میں دعا زیادہ مؤثر سبب ہے۔ لیکن جب دعا قبول ہوتے دکھائی نہیں دیتی تو بعض لوگ تقدیر کے سلسلہ میں کئی شبہات کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص کہنے لگا کہ میں نے آٹھ دس ماہ مسلسل تہجد کے وقت اٹھ کر اللہ سے ایک نیک کام کی دعا کی، مگر اس کے باوجود میری دعا قبول نہ ہوئی۔ ظاہر ہے میری تقدیر میں وہ چیز نہیں لکھی تھی، اس لیے دعا کے باوجود نہ مل سکی۔ اور اگر وہ چیز

۱۔ ترمذی، کتاب الدعوات، باب منه الدعاء مخ العبادة، ح۳۳۷۳۔

میری تقدیر میں لکھی ہوتی تو یہ چیز مجھے دعا کرنے کے بغیر بھی مل جاتی!

یہ شبہ کئی لوگوں کو ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر درج ذیل حدیث پیش نظر رہے تو یہ شبہ دور ہو سکتا ہے:

((عَنْ أَبِی سَعِیْدٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَیْسَ فِیْهَا إِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا إِحْدٰی ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ وَإِمَّا أَنْ یَدَّخِرَهَا لَهُ فِی الْآخِرَةِ وَإِمَّا أَنْ یُصْرَفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا قَالُوْا إِذًا نُكْثِرُ قَالَ: اَللّٰهُ أَكْثَرُ))[1]

"حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان بھی دعا کرے اور اس میں کوئی گناہ اور قطع رحمی کی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے ایک ضرور عطا کرتے ہیں۔

۱۔ یا تو اس کی دعا کے لیے جلدی کر دی جاتی ہے (یعنی دنیا میں دعا قبول ہو جاتی ہے)۔

۲۔ یا اس دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ (ثواب) بنا دیا جاتا ہے۔

۳۔ یا اس دعا کے بدلے آنے والی کسی مصیبت کو ٹال دیا جاتا ہے۔

صحابہ کہنے لگے کہ پھر تو ہم بہت زیادہ دعا کیا کریں گے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ کے خزانے اس سے بھی زیادہ ہیں"۔

مذکورہ بالا تین صورتیں دعا کی قبولیت ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی یا تو قبولیت کی شکل یہ ہوتی ہے کہ انسان جو کچھ دنیا میں مانگتا ہے، وہی اسے مل جاتا ہے۔ یا دنیا میں کچھ نہیں ملتا مگر ان تمام دعاؤں کو آخرت میں اجر و ثواب بنا دیا جاتا ہے اور یا قبولیت کی تیسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اس دعا کی برکت سے دعا کرنے والے کو آنے والی کسی اور مصیبت سے پیشگی محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اب پہلی صورت جس میں دعا دنیا میں قبول ہوتی ہے، یہ تو سب کو معلوم ہو جاتی ہے مگر باقی دو صورتیں چونکہ ہمارے علم میں نہیں ہوتیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ شاید دعا قبول نہیں ہوئی۔

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ انسان کو چاہیے کہ بکثرت دعا کرے، جیسا کہ صحابہ کرامؓ یہ حدیث سنتے ہی نبی کریم ﷺ سے کہنے لگے کہ پھر تو ہم بہت زیادہ دعا کیا کریں گے۔ اب اگر دعا بے فائدہ چیز ہوتی تو نبی کریم ﷺ لوگوں کو نہ یہ حدیث سناتے اور نہ ان کی رغبت اور شوق کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اسی طرح کئی اور احادیث میں آپ ﷺ نے دعا کو عبادت کی روح اور مغز قرار دیا ہے۔

۱۔ احمد، ج ۱۰۷۰۹۔ صحیح الترغیب والترہیب (للالبانی)، ج ۱۶۳۳۔ صحیح الجامع الصغیر، ج ۵۷۱۴۔

توکل اور تقدیر

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا سہارا سمجھے اور اسی پر حقیقی توکل کرے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [سورة المائدة:۲۳]

''اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اگر تم ایمان والے ہو''۔

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ [سورة الطلاق:۳]

''جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے''۔

ایسی آیات کے پیش نظر بعض لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ شاید اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی ہے، حالانکہ یہ چیز توکل کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ توکل یہ ہے کہ انسان عمل سے پہلے بھی یہی ایمان رکھے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے مقدر ہے۔ اور پھر عمل اور اسباب کو اختیار کرتے ہوئے بھی یہی سوچ کارفرما ہو کہ یہ بھی تقدیر کا حصہ ہے پھر اس کے بعد وہ اپنے عمل اور کوشش وغیرہ کے نتائج کو اللہ کے سپرد کر دے کہ جتنی محنت اور کوشش میرے لیے ممکن تھی، وہ میں نے کر لی ہے، باقی نتیجہ اب اللہ کے سپرد۔ اگر اللہ نے میری قسمت میں یہ لکھا ہوا تو میری اس محنت اور کوشش کے سبب کو اختیار کرنے کے بعد یہ میرے مقدر میں ہو جائے گا ورنہ نہیں ہوگا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا   پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا:

((يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَعْقِلُهَا وَ اَتَوَكَّلُ اَوْ اُطْلِقُهَا وَ اَتَوَكَّلُ " قَالَ: اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ))[1]

''اے اللہ کے رسول! میں جانور (اونٹ وغیرہ) کو باندھو پھر اللہ پر توکل کروں یا اللہ پر توکل اور بھروسہ کر کے اسے کھلا چھوڑ دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے باندھو پھر اللہ پر توکل کرو''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اسباب اختیار نہ کرے بلکہ توکل کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اسباب اختیار کرے اور ممکنہ حد تک خود کوشش کرے پھر نتیجے کے بارے میں اللہ پر توکل کرے۔

۱۔ ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب حديث اعقلها وتوكل، ح۲۵۱۷۔

۳۔ کیا تقدیر بدل سکتی ہے؟

مسئلہ تقدیر کے بارے میں بعض نصوص (آیات واحادیث) سے ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تقدیر میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور تقدیر میں تبدیلی نہیں ہوتی تو پھر دعا وغیرہ کے ساتھ اس میں کمی بیشی یا تبدیلی کیونکر ہوتی ہے۔

جواب

تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں قرآن مجید میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں۔ ایک وہ آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور ایک وہ آیات ہیں جن میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ تقدیر میں اللہ چاہیں تو تبدیلی بھی کر دیتے ہیں۔

مثلاً تقدیر میں تبدیلی اور کمی بیشی کے بارے میں ایک آیت میں اس طرح کہا گیا ہے:

﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴾ [سورة الرعد: ٣٩]

''اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے''۔

اسی طرح حضرت نوح کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ [سورة نوح: ٣]

''تم اللہ کی عبادت کرو، اور اسی سے ڈرو اور میرا کہا مانو تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایک وقت مقررہ تک چھوڑ دے گا۔ یقیناً اللہ کا وعدہ جب آ جاتا ہے تو مؤخر نہیں ہوتا، کاش تمہیں سمجھ ہوتی!''

ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم نیک عمل کرو گے تو اللہ تمہیں مزید مہلت دے گا گویا جو مہلت پہلے تقدیر میں لکھی جا چکی ہے، اس میں اضافہ ہو جائے گا۔

جبکہ کئی ایک آیات میں ہے کہ جو چیز تقدیر میں لکھی جا چکی، اس میں ایک لمحہ ولحظہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی، مثلاً موت کے وقت مقررہ کے بارے میں یہ حقیقت اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴾

[illegible] کے لیے ایک میعاد معین ہے پس جس وقت ان کی میعاد آ جائے گی اس وقت وہ ایک

ساعت بھی نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے"۔ [سورۃ الاعراف: ۳۴]

﴿ وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ۝ مَّا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴾

"کسی بستی کو ہم نے ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لیے مقررہ نوشتہ تھا۔ کوئی گروہ اپنی موت سے نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے رہتا ہے"۔ [سورۃ الحجر: ۴، ۵]

اسی طرح بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے ذریعے تقدیر بدل جاتی ہے جیسا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ))[1]

"کوئی چیز تقدیر کو ٹالتی نہیں سوائے دعا کے اور نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے"۔

اسی طرح بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کے ذریعے رزق اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ))[2]

"جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی کی جائے اور اس کے نشان قدم باقی رکھنے میں (طوالت دی جائے (یعنی عمر میں اضافہ (یا بقول بعض) برکت دی جائے) تو اسے چاہیے کہ اپنی رشتہ داری کو ملائے"۔

ایک حدیث میں ہے:

((صِلَةُ الرَّحِمِ تَزِيدُ فِي الْعُمُرِ))[3]

"رشتہ داری ملانے سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "آدمی گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اور صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے"۔[4]

۱۔ ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء لا یرد القدر الا الدعاء، ۲۱۳۹۔

۲۔ بخاری، کتاب الادب، باب من بسط له في الرزق بصلة الرحم، ح ۵۹۸۵۔

۳۔ صحیح الجامع الصغیر، ح ۳۷۶۶۔ الصحیحة، ح ۱۹۰۸۔

۴۔ مسند احمد، ج ۵ ص ۲۷۷۔

تعارض کا حل

ان دوطرح کی بظاہر متعارض آیات اور اسی طرح تقدیر میں تبدیلی سے متعلقہ احادیث کے پیش نظر علمائے اہل سنت نے تقدیر اور قضا کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے؛ ایک کو قضائے مبرم کہا جاتا ہے اور دوسری کو قضائے معلق۔ قضائے مبرم سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ اللہ کے پاس ہے۔ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ یہی تقدیر ہے اور کسی انسان، فرشتے یا جن کی اس تک رسائی نہیں ہے، یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

قضائے معلق سے مراد وہ تقدیر ہے جس میں مختلف اسباب کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ تقدیر اللہ نے فرشتوں کے سپرد کر رکھی ہے اور جب کبھی اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں ہی کو حکم دیتے ہیں کہ اس میں فلاں فلاں تبدیلی کر دو۔ جن آیات اور احادیث میں تقدیر میں تبدیلی کے بارے میں ذکر ملتا ہے، ان سے مراد اسی تقدیر میں تبدیلی ہے اور اس میں جو تبدیلی کی جاتی ہے، وہ بالآخر اسی تقدیر کے مطابق کی جاتی ہے جو اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ گویا اصل تقدیر جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، وہ وہی ہے جو اللہ کے علم میں ہے۔

صلہ رحمی کے ذریعے موت کے وقت اور رزق میں اضافہ سے متعلقہ روایت کے حوالے سے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''اَجل (یعنی موت کی مدت معینہ) دو طرح کی ہے: ایک کو اَجل مطلق کہا جاتا ہے جس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور دوسری کو اجل مقید کہا جاتا ہے، یہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم دیتے ہیں کہ وہ بندے کی اجل (مدت معین) لکھ دے اور اگر بندہ صلہ رحمی کی نیکی کرتا ہے تو اللہ فرشتے کو حکم دیتے ہیں کہ اس کی اس مدت اور رزق میں اضافہ کر دو۔ فرشتے کو تو علم نہیں ہوتا کہ اس تقدیر میں یہ تبدیلی کی جائے گی یا نہیں لیکن اللہ کو قطعی طور پر اس کا علم ہوتا ہے (کہ اس کی مدت فلاں حد تک ہے) اور جب (اللہ کے علم کے مطابق) وہ مدت آ جاتی ہے تو پھر اس میں نہ جلدی کی جاتی ہے اور نہ مہلت دی جاتی ہے''۔[۱]

۱۔ مجموع الفتاوی، ج۸، ص۵۱۷۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں لکھتے ہیں:

''جو کچھ اللہ کے علم میں پہلے سے موجود ہے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، جس تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے، یہ وہ ہے جو لوگوں کے سامنے کسی عمل کرنے والے کے عمل کے بارے میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کا تعلق انسان کے ساتھ مامور فرشتوں کے ساتھ ہے (جن کے پاس انسان کی تقدیر لکھی ہوتی ہے) پس جو تقدیر ان فرشتوں کے پاس ہے، اس میں تبدیلی اور حک و اضافہ ہوتا ہے مثلاً عمر میں کمی بیشی وغیرہ۔ اور جو تقدیر اللہ کے علم میں ہے، اس میں نہ تبدیلی ہوتی ہے اور نہ کوئی حک و اضافہ اور اصل علم اللہ ہی کے پاس ہے''۔[1]

دوسرا اسلوب

بعض اہل علم اس مسئلہ میں یہ رائے دیتے ہیں کہ تقدیر ایک ہی ہے جو لکھی جا چکی، اور اسباب کے ذریعے اس میں تبدیلی سے متعلقہ آیات یا احادیث کا یہ مطلب نہیں کہ اس تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد:

۱۔ یا تو برکت اور عدم برکت ہے یعنی عمر یا رزق میں حسی طور پر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ معنوی طور پر برکت ہوتی ہے۔

۲۔ یا اگر برکت کا مفہوم مراد نہ لیا جائے بلکہ حقیقتاً تبدیلی ہی مراد لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اسباب اور ان کے ذریعے ہونے والی تبدیلی بھی اسی تقدیر میں پہلے سے لکھی جا چکی ہے۔ لہٰذا جو شخص اسباب اختیار کرتا ہے، اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ فلاں فلاں اسباب اختیار کرے گا اور اس کے نتیجے میں اس کی تقدیر یہ بنے گی۔ اور جو اسباب اختیار نہیں کرتا، اس کی تقدیر ہی میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ فلاں فلاں اسباب اختیار نہیں کرے گا اور اس کے نتیجہ میں اس کے ساتھ یہ کچھ ہوگا جو اسباب اختیار نہ کرنے کی وجہ سے بالعموم متوقع ہوتا ہے۔

۱۔ فتح الباری، ج ۱۱، ص ۴۸۸۔

۴۔ تقدیر اور ہدایت و گمراہی کا مسئلہ

قرآن مجید کی بعض آیات اور اسی طرح بعض صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ کے حکم سے ہے اور انسان اس سلسلہ میں مجبور ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے کسی کی گمراہی کا فیصلہ کر دیا گیا ہے تو پھر وہ کبھی راہ ہدایت نہیں پا سکتا اور اگر اللہ کی طرف سے ہدایت کی توفیق ہو جائے تو پھر کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اس معنی و مفہوم کی چند آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱)...... ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ [سورة الانعام:۱۲۵]

''پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہے، اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو بے راہ رکھنا چاہے، اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے''۔

یعنی جس طرح آسمان کی طرف قدم اٹھا کر اوپر چڑھنا ممکن نہیں، اسی طرح بے راہ کے لیے راہ ہدایت کی طرف آنا ممکن نہیں رہتا۔

(۲)...... ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ﴾ [سورة الاعراف: ۱۵۵]

''یہ واقعہ محض تیری طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو تو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جسے چاہے ہدایت پر قائم رکھے''۔

(۳)...... ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ [سورة الكهف:۱۷]

''اللہ تعالیٰ جس کی رہبری فرمائے، وہ راہ راست پر ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے، ناممکن ہے کہ آپ اس کے لیے کوئی کارساز اور رہنما پائیں''۔

(٤)...... ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [سورة فاطر:۸]

''یقیناً اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے راہ راست دکھاتا ہے''۔

یہی مضمون بعض احادیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ ان آیات اور احادیث کو جب تک اسلام کے وسیع دائرے اور دیگر آیات واحادیث کے ساتھ ملا کر نہ سمجھا جائے تب تک اس کا صحیح معنی ومفہوم واضح نہیں ہو سکتا بلکہ صرف اسی یک طرفہ مفہوم کو اخذ کر لینے سے بہت سے اور شبہات اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً:

۱۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے پوری صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے۔ اب اگر پہلے ہی سے اللہ نے کسی کے لیے گمراہی کا فیصلہ کر دیا ہے تو پھر اس گمراہی کی راہ پر چلنے والے کو اس بات پر سزا دینا یقیناً ظلم ہے کہ تم نے گمراہی کی راہ اختیار کیوں کی؟ اور اللہ کی عدالت میں وہ کہہ سکتا ہے کہ یا اللہ! مجھے تیری طرف سے اختیار ہی نہ تھا کہ میں ہدایت کی راہ پر چلتا، اس لیے مجھے سزا کس بات کی؟!

بلکہ قرآن مجید میں بعض کفار کی ٹھیک یہی بات کئی جگہ بیان بھی کی گئی کہ انہوں نے اللہ پر اعتراض کرتے اور اپنی تقدیر کا بہانا بناتے ہوئے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک اور گمراہی کی راہ اختیار نہ کرتے، جیسا کہ سورۃ الانعام میں ہے:

﴿ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ [سورة الانعام: ١٤٨]

''یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے۔ (اللہ فرماتے ہیں) اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی تکذیب کی تھی''۔

۲۔ اسی طرح اس یک طرفہ موقف پر ایک یہ اعتراض بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہے کہ اتنے لوگوں کو گمراہی اور جہنم کی راہ پر ڈالنا ہے اور اتنوں کو جنت کی، تو پھر گمراہی اور جہنم کی راہ پر جانے والوں سے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے کہ گمراہی اور جہنم کی راہ پر نہ چلو، بلکہ ہدایت اور جنت کی راہ پر چلو۔ یہ تو عجیب بات ہے کہ ایک بندے کو خود ہی ایک راہ پر زبردستی چلا دیا جائے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ اس پر نہ چلو، بلکہ دوسری راہ پر چلو اور ادھر دوسری راہ پر چلنے بھی

نہ دیا جائے......!!

یہ رویہ تو ایک انسان بھی دوسرے کے ساتھ اختیار کرے تو اس کی سخت مذمت کی جاتی اور اسے برا سمجھا جاتا ہے تو پھر اللہ کے بارے میں یہ کیسے فرض کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ بھی انسانوں کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں، معاذ اللہ ایسا تو سوچنا بھی نہیں چاہیے!

اصل حقیقت کیا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خیر اور توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ جب کہ اس کا ماحول، معاشرہ، حالات اور والدین وغیرہ اسے یا تو اسی فطرت پر قائم رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ خود بھی اس فطرت پر قائم ہوں یا پھر یہ سب مل کر یا ان میں سے کوئی ایک چیز اس انسان کی فطرت سلیمہ کو مسخ کر کے اسے غلط راہ پر چلنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس بات کی تائید درج ذیل دو حدیثوں سے ہوتی ہے:

۱۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))[۱]

”ہر نومولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین (اگر یہودی ہوں) تو اسے یہودی بنا دیتے ہیں (عیسائی ہوں تو) عیسائی بنا لیتے ہیں (اور مجوسی ہوں تو) مجوسی بنا لیتے ہیں“۔

۲۔ دوسری حدیث حضرت عیاض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوْا بِي لَمْ أُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا......))[۲]

”بے شک میں نے اپنے بندوں کو شرک سے پاک (یعنی دینِ فطرت پر) پیدا کیا ہے پھر ان کے پاس شیطان آئے جنہوں نے انہیں ان کے دین سے برگشتہ کر دیا اور جو چیزیں میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، وہ شیطانوں نے ان کے لیے حرام کر دیں اور شیطانوں نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ یہ میرے ساتھ شرک کریں، جب کہ اس شرک کے حق میں، میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری“۔

۱۔ بخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین، حدیث ۱۳۸۵۔

۲۔ مسلم، کتاب الجنة، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة واهل النار، ح ۲۸۶۵۔

اب ان دلائل سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ نے انسان کو ہدایت اور خیر کی فطرت پر پیدا کیا ہے مگر انسان شیطانی ہتھکنڈوں، اپنے نفس کے وسوسوں اور نفسانی خواہشات یا غلط سوسائٹی اور برے ماحول کی وجہ سے گمراہی کی راہ پر چل نکلتا ہے اور گمراہی کی راہ پر چلتے چلتے بعض اوقات وہ اتنی دور نکل جاتا ہے کہ واپسی کا سوچنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہی نہیں کہ میں خیر اور ہدایت کی راہ پر واپس پلٹ آؤں۔ اور ظاہر ہے جو خود ہی یہ فیصلہ کر لے تو پھر اللہ بھی غنی اور بے پرواہ ہے، اللہ کو کیا ضرورت کہ اسے زبردستی ہدایت کی راہ پر لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون نہیں کہ انسانوں کو اختیار دینے کے بعد زبردستی ہدایت کی راہ پر لایا جائے اور نہ ہی زبردستی اللہ انہیں گمراہی کی راہ پر دھکیلتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی جن آیات میں گمراہی کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے، ان میں اکثر وبیشتر آیات میں اس کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ یہاں لوگوں کے بارے میں بات کی گئی ہے جو خود ہی گمراہی کو پسند کر لیتے ہیں۔ ایسی چند آیات ذیل میں ملاحظہ کریں:

(۱)...... ﴿ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾ [سورة البقرة: ۱۰]

''ان (کافروں) کے دلوں میں بیماری تھی، پس اللہ نے انہیں بیماری میں اور بڑھا دیا''۔

یعنی ان کے دلوں میں پہلے ہی بیماری تھی اور وہ خود ہی ایک چیز کو نہیں چاہتے تھے، اس لیے اللہ نے بھی ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ انہی کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے:

(۲)...... ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ [سورة البقرة: ۷]

''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے''۔

(۳)...... ﴿ وَمَا یُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴾ [سورة البقرة: ۲٦]

''اور اللہ اس (مچھر وغیرہ کی مثال) کے ساتھ صرف فاسقوں ہی کو گمراہ کرتا ہے''۔

(٤)...... ﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً ﴾ [سورة المائدة: ۱۳]

''پھر ان (بنی اسرائیلیوں) کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر اپنی لعنت نازل فرما دی اور ان کے دل سخت کر دیئے''۔

یعنی اگر وہ عہد شکنی کا جرم نہ کرتے تو اللہ کی لعنت اور دلوں کی سختی کی سزا سے بچ جاتے اور ہدایت پاتے۔

(۵)...... ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [سورة النساء: ۱۱۵]

''اور جو کوئی باوجود راہِ ہدایت واضح ہو جانے کے بھی رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے تو ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہوا، اور اسے دوزخ میں ڈال دیں گے''۔

یہ آیت اپنے موضوع پر بالکل واضح ہے کہ جو خود ہی غلط راہ کو پسند کر لیتا ہے، پھر اللہ بھی اسے اسی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

(٦)...... ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [سورة المائدة: ٥١]

''اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا''۔

(۷)...... ﴿فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [سورة الاعراف: ۳۰]

''بعض لوگوں کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہوگئی ہے، (یہ گمراہ ہونے والے وہ ہیں کہ) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنالیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ راہ راست پر ہیں''۔

اب ظاہر ہے ایک شخص خود ہی شیطان کی پیروی پر راضی ہو جائے تو پھر اللہ کو کیا ضرورت کہ اسے زبردستی اپنی راہ پر چلائے۔

(۸)...... ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ [سورة الزمر: ۳]

''بے شک اللہ جھوٹے اور ناشکرے کو کبھی ہدایت کی راہ نہیں دکھاتا''۔

(۹)...... ﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ۝ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ [سورة غافر: ۳٤،۳۵]

''اسی طرح اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے ہر اس شخص کو جو حد سے بڑھ جانے والا شک وشبہ کرنے والا ہو۔ جو بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور مومنوں

کے نزدیک یہ تو بڑی بیزاری کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر مغرور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے''۔

(۱۰)...... ﴿فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [سورة الصف:۵]

''پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو (اور) ٹیڑھا کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا''۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے ہدایت کا راستہ انہی لوگوں سے بند کیا جاتا ہے جو پہلے ہی اسے اپنے لیے بند کیے بیٹھے ہوں اور خود ہی اس طرف آنا پسند نہ کرتے ہوں ورنہ جو لوگ ہدایت کی راہ پسند کرتے ہیں اور اس طرف قدم اٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہدایت کی راہ کو اور واضح اور آسان بنا دیتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِيْ يَمْشِيْ اَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً))

''اگر میرا بندہ میری طرف ایک بالشت (انگوٹھے سے چھنگلی انگلی تک کی مقدار) برابر آتا ہے، میں اس کی طرف ایک بازو (گز) برابر آتا ہوں اور جو میری طرف ایک بازو برابر آتا ہے، میں اس کی طرف دونوں بازوؤں کے پھیلاؤ برابر آتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے، میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے''۔[1]

تفہیم کا ایک اور اسلوب

بعض اہل علم اس مسئلہ کو ایک اور اسلوب کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں مطلق طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [سورة الفتح:۱۴]

۱۔ بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله : ویحذرکم الله نفسه۔

''اور زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے، جسے چاہے وہ بخش دے اور جسے چاہے وہ عذاب دے''۔

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اللہ کے ہاں بخشش، رحمت اور عذاب کے سلسلہ میں کوئی ضابطہ نہیں کہ کس پر رحم کیا جائے گا، کسے وہ عذاب دے گا مگر دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور ان آیات میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کو بخشیں گے اور کس کو نہیں بخشیں گے جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے کہ شرک کرنے والے کو اللہ عذاب دیں گے، اس کی بخشش نہیں کریں گے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ [سورة النسآء: ١١٦]

''یقیناً اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے، ہاں وہ (اللہ) شرک کے علاوہ گناہ، جس کے چاہے معاف فرما دیتا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا''۔

اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور اس پر قائم رہیں گے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہیں میں عذاب نہیں دوں گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ [النسآء: ١٤٧]

''اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا؟ اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور باایمان رہو''۔

اسی طرح جن آیات میں مطلق طور پر یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت سے نوازے، اس کی توضیح دیگر آیات کی روشنی میں کی جائے گی اور وہ یہ ہے کہ جو ہدایت کی راہ پر چلتا ہے، اسے اللہ اس راہ پر چلاتا ہے اور جو خود ہی گمراہی کو پسند کرلے تو پھر اللہ بھی اسے گمراہی ہی میں رکھتے ہیں، زبردستی ہدایت کی راہ پر نہیں چلاتے۔

......☆......

باب ۵

تقدیر پر ایمان لانے کے فوائد

تقدیر کے بارے میں اسلام نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اس میں بہت سے فوائد ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے:

اللہ کی وحدانیت وعظمت کا اقرار اور شرک سے بچاؤ

تقدیر پر ایمان لانے سے انسان کے ذہن میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی قدرت وعظمت اُجاگر ہوتی ہے۔ اسے یقین ہوجاتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ ہی کی فرمانروائی قائم ہے، کوئی اور طاقت اس کے مقابلہ میں کھڑی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی کوئی اس کی مشیت کے بغیر یہاں کچھ کرسکتا ہے۔ جہاں تک انسانی اختیار کی بات ہے تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ اختیار بھی اس اللہ ہی نے ایک محدود دائرے اور محدود وقت تک کے لیے دنیا میں اپنے بندوں کو خود دیا ہے کہ وہ اپنی اس محدود مرضی اور اختیار سے خیر یا شر جو راہ چاہیں اپنائیں اور روزِ قیامت اسی اختیار کی بنیاد پر انسان سے اس کے اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔

جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ شر کا خالق انسان ہے یا کوئی اور طاقت ہے جو شر پیدا کرتی ہے تو دونوں صورتوں میں انہوں نے گویا اللہ کے ساتھ شریک تسلیم کرلیا حالانکہ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ ہر چیز کا خالق وہ اکیلا ہے، یہ الگ بات ہے کہ خیر کی طرح شر کا وجود بھی اس کی حکمت سے خالی نہیں بلکہ یہ بھی اس کی حکمتوں کے تابع ہے اور انسان کو اختیار دے کر وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسان خیر کی راہ اپناتا ہے یا شر کی، اور اگر کوئی شر کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا روزِ قیامت مؤاخذہ کیا جائے گا۔

صبر وشکر

تقدیر پر ایمان لانے سے انسان میں صبر وشکر والا رویہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تقدیر کو تسلیم کرنے والا انسان جانتا ہے کہ اسے جو نعمت ملتی ہے وہ اللہ کا فضل ہے، گوکہ اس میں اس کی اپنی محنت بھی شامل ہوتی ہے مگر ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ یہ محنت بھی تبھی کارگر ثابت ہوتی ہے جب اللہ کی طرف سے اس کا بارآور اور فائدہ مند ہونا مقدر ہو ورنہ ہزاروں محنتیں اللہ نہ چاہے تو رائیگاں بھی چلی جاتی ہیں۔

اسی طرح تقدیر پر ایمان رکھنے والا ایک مسلمان نقصان اور مصیبت پہنچنے پر یہی یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ کی

طرف سے مقدر تھا، اس لیے ایسا ہو کر ہی رہنا تھا۔ یہ رویہ اور سوچ انسان کو عاجز کر دینے اور عمل سے روک رکھنے کی بجائے ایک طرف اسے صبر اور حوصلہ دلاتی ہے اور دوسری طرف اس میں مزید اس بات کی رغبت پیدا کرتی ہے کہ اسے پھر سے اللہ پر توکل کر کے محنت کرنی چاہیے کیونکہ ضروری نہیں کہ اس کے مقدر میں ہمیشہ نقصان اور خسارہ ہی لکھا ہو۔

شکر اور صبر کے اس رویے کو درج ذیل حدیث میں ایک مومن شخص کے لیے عمدہ ترین چیز قرار دیا گیا ہے:

((عَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ))(۱)

''حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بے شک مومن کا معاملہ اتنا عمدہ ہے کہ کوئی غیر مومن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر مومن شخص کو کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ اس پر (اللہ کا) شکر ادا کرتا ہے اور یہ (اللہ کا شکر) اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اسے مصیبت پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے بہتر ہے''۔

اطمینانِ قلب

اسی طرح تقدیر پر ایمان رکھنے والا مسلمان آدمی اپنے سے زیادہ مالدار، صحت مند، خوشحال اور خوش شکل کو دیکھ کر حسرت اور افسوس کی وادیوں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ سب اللہ کی تقسیم ہے جو دنیا کی حد تک ہے اور اسے میں اپنی قوت اور زورِ بازو سے بدل نہیں سکتا، اس لیے مجھے اسی پر صبر کرنا چاہیے اور اپنی آخرت کو بہتر بنانے کے لیے اللہ کے اُحکام پر عمل کرنا چاہیے تاکہ اُخروی زندگی میں مجھے وہ سب مل جائے جس کا دنیا میں کوئی انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ رویہ اور سوچ اس کی زندگی میں سکون اور راحت پیدا کرتی ہے اور اسے قلبی طور پر ایک ایسا اطمینان حاصل ہوتا ہے جو بڑے بڑے شاہوں اور مالداروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ لیکن جس شخص کو تقدیر پر یقین نہ ہو یا یقین کمزور ہو تو وہ چھوٹی چھوٹی مشکلات پر اتنا غم لے لیتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ کئی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

خشیتِ الٰہی

تقدیر پر ایمان رکھنے والا چونکہ اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ اچھا اور برا سب کچھ اللہ کی طرف سے مقدر ہوتا

۱۔ مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب امر المومن کله خیر، ح۲۹۹۹۔

ہے، اس لیے وہ ہمیشہ اللہ کے حضور عاجزی اختیار کرتا اور اس کا متقی بندہ بن کر رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اگر مال و دولت اور عزت و شہرت ملتی ہے تو وہ سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اور زیادہ اللہ کے حضور خشوع خضوع اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قارون کی اور حضرت سلیمانؑ کی مثالوں سے سمجھا دیا کہ ایک سرکش بندہ مال و دولت اور عزت و شہرت پا کر کیا راہ اختیار کرتا ہے اور ایک اللہ کا فرمانبردار بندہ ایسی صورت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔

مثبت سوچ

تقدیر پر ایمان رکھنے والا ہمیشہ مثبت سوچ اپناتا ہے۔ نقصان ہو جانے پر وہ یہ سوچ کر جدوجہد چھوڑ نہیں دیتا کہ میری تو قسمت ہی ایسی تھی۔ یا اپنے آپ کو اور ان ذرائع کو کوستا اور لعن طعن نہیں کرتا رہتا جن کی وجہ سے اسے کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے اور نہ ہی اسی دکھ اور پریشانی میں اپنی انرجی ضائع کرتا ہے بلکہ مصیبت پر وہ یہی کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسا ہی مقدر تھا اور پھر مزید مثبت سوچ کے ساتھ وہ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ایک نقصان ہوا تو اس کی تلافی کے لیے پہلے سے زیادہ محنت اور توجہ سے کام لیتا ہے اور جن مادی اسباب کی وجہ سے وہ نقصان ہوا، آئندہ ان سے بچاؤ کی تدابیر کرتا ہے اور اس سلسلہ میں خود اپنی سستی اور کاہلی کو بھی دور کرتا ہے۔

عزیمت و استقامت

تقدیر پر ایمان رکھنے والا بندہ ہمیشہ عزیمت و استقامت کی راہ اختیار کرتا ہے، اس لیے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی، موت، صحت، بیماری، خوشی، غمی، عزت، ذلت ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وقت سے پہلے کوئی موت نہیں دے سکتا۔ جو لقمہ منہ میں جانا ہے، دنیا کی کوئی طاقت اسے چھین نہیں سکتی۔ اگر اللہ نے عزت رکھنی ہے تو دنیا والے اس عزت کو ذلت میں بدل نہیں سکتے۔

اس لیے ہر نازک اور پرخطر موقع پر ایسا بندہ اللہ پر توکل کرتا ہے اور حق کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے عزیمت و استقامت کی راہ پر چلنا آسان بنا دیتے ہیں۔

یہی وہ عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ حق کی راہ میں لڑ مرنے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہر طاقت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ دیا......!!

باب ٦

تقدیر، قسمت شناسی اور مستقبل بینی

[کیا تقدیر پہلے ہی معلوم کی جا سکتی ہے؟]

تقدیر کے بارے میں اب تک جتنی بحث کی گئی ہے، اس سے کم از کم یہ حقیقت سمجھ آ جانی چاہیے کہ تقدیر اللہ کا راز ہے، جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے تقدیر شناسی اور مستقبل بینی کی ہر وہ کوشش جس سے انسان اپنی تقدیر پیشگی معلوم کر سکے، سراسر جھوٹ اور حماقت کی بات ہے۔ سچے خواب کے ذریعے انسانی تقدیر یا مستقبل کے کسی معاملہ کی طرف اشارہ ممکن ہے مگر خوابوں پر انسان کو کوئی طاقت اور قوت حاصل نہیں۔ اسی طرح دعا کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور ایسی طاقت نہیں ہے کہ جس کے ذریعے وہ اپنی تقدیر میں حسبِ منشا کوئی تبدیلی کر سکے۔ دعا سے بھی وہ تقدیر تبدیل ہوتی ہے جو فرشتوں کے پاس لکھی ہوتی ہے اور جسے فقہی و کلامی لٹریچر میں 'تقدیر معلق' کہا جاتا ہے اور یہ تبدیلی بھی اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، انسان کی مرضی اور چاہت سے نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ انسان جب چاہے اور جو چاہے دعا کے ذریعے اس میں تبدیلی کروا لے۔ دعا کرنا اور اس کا قبول ہو جانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں لینا چاہیے کہ دعا بے فائدہ ہے اور انسان کو دعا نہیں کرنی چاہیے۔ دعا کرنی چاہیے اور اس کے اسلامی آداب وضوابط کے ساتھ کرنی چاہیے۔

ہمارے ہاں جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بعض علوم ایسے ہیں جن سے انسان اپنی قسمت معلوم کر لیتا ہے۔ بالخصوص دست شناسی، اعداد و جفر اور علم نجوم وغیرہ کو اس سلسلہ میں مؤثر علوم کی حیثیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی چیز بھی مستند اور مؤثر نہیں ہے۔ ان علوم کی پوری تفصیل تو ہماری دوسری کتاب: ''انسان اور کالے پیلے علوم'' میں آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں، یہاں صرف اختصار کے ساتھ چند چیزوں کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

ا۔دست شناسی/Palmistry اور قسمت وتقدیر

جاہل اور وہمی قسم کے لوگوں میں دست شناسی (پامسٹری) کو غیب دانی اور مستقبل بینی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ پیشہ وَر دست شناس (پامسٹ/Palmist) حضرات تو اسے ایک سائنٹیفک علم ثابت کرتے نہیں تھکتے۔ یہ لوگوں کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر ان کے ماضی اور اَخلاق وکردار کے بارے میں یا ان کے مستقبل اور قسمت کے بارے میں غیبی معلومات کا دعویٰ کرتے ہیں اور مستقبل کے حوالے سے پیش گوئیاں بھی کرتے ہیں۔

پامسٹ حضرات کا کہنا ہے کہ انسان کے ایک ہاتھ کی لکیروں میں اس کے ماضی کا ریکارڈ ہوتا ہے، دوسرے میں مستقبل کا اور دونوں کو ملا کر دیکھنے سے اس کے سیرت وکردار کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی دست شناسی کے حوالے سے یہ بات درست ہے؟ اگر درست ہے تو کس بنیاد پر؟ اور بحیثیتِ مسلمان کیا ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے ثبوت کے لیے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل مانگیں؟

دست شناس تو قرآن وحدیث کے حوالے سے اپنے حق میں ہمیں کوئی دلیل نہیں دیتے مگر جب ہم اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان دست شناسوں کے موقف کے خلاف بے شمار دلائل ملتے ہیں مثلاً قرآن مجید میں بارہا یہ کہا گیا کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ تقدیر اور قسمت اللہ نے طے کر رکھی ہے اور اس کا علم بھی کسی کے پاس نہیں۔ لہٰذا اگر ہاتھوں کی لکیروں میں ماضی یا مستقبل کی کسی غیبی بات کا اشارہ ہوتا تو اللہ کے آخری پیغمبرؐ جن پر دین مکمل کر دیا گیا، وہ ضرور اس بارے میں ہمیں کچھ نہ کچھ بتا دیتے۔ مگر آپ ﷺ نے اس کی تائید میں امت کو کچھ نہیں بتایا بلکہ ایسے لوگوں کے پاس جانے ہی سے سخت منع فرمایا ہے۔ [ایسی احادیث ہم آگے ذکر کریں گے۔]

دست شناسوں کے دلائل

جب دست شناسوں سے اس پہلو سے بات کی جاتی ہے تو ان کے پاس سوائے چند ٹوٹکوں کے کوئی معقول و مستند جواب نہیں ہوتا۔ دست شناس اپنے علم (پامسٹری) کے جواز میں جو دلائل دیتے ہیں، وہ بنیادی طور پر دو ہی ہیں۔

۱)...... ایک تو یہ کہ ان کے بقول دست شناسی مشاہداتی اور سائنسی علم ہے۔ جس طرح بہت سے سائنسی علوم بحیثیت علم اسلام آنے کے بہت بعد معلوم ہوئے ہیں، اسی طرح یہ علم بھی بار ہا مشاہدات کے بعد معلوم کیا گیا ہے۔ اور اس کے سائنٹیفک ہونے کی دلیل وہ مشاہدات ہیں جو ہاتھوں کی لکیروں اور ان کے ابھاروں کی بنیاد پر بار ہا کیے گئے اور (دست شناسوں کے بقول) بے شمار مرتبہ درست ثابت ہوئے ہیں۔

دست شناسی کو سائنٹیفک علم قرار دینے کی یہ دلیل اتنی کمزور ہے کہ خود بہت سے دست شناسوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعتاً کوئی سائنسی علم ہوتا تو اس کے اصول و ضوابط اور نتائج ہمیشہ ایک سے ہوتے اور سب دست شناس انہیں من وعن تسلیم کرتے، مگر دست شناسی کی دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ دست شناسوں کے ہاں کئی مکتب فکر ہیں، ہر ایک کے اصول و ضوابط دوسرے سے مختلف ہیں اور ظاہر ہے جب اصول و ضوابط مختلف ہوں گے تو نتائج بھی مختلف ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دست شناس کے ہاں ایک لکیر اگر فرض کیا خوش قسمتی کی علامت ہے تو دوسرے کے ہاں وہی بدقسمتی کی علامت ثابت ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اسے سائنٹیفک علم قرار دینے پر مصر ہو تو اس کی سوچ پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

۲)...... پامسٹری سے تعلق رکھنے والے حضرات اپنی حمایت میں دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھوں پر جو خطوط اور لکیریں پیدا کی ہیں یہ بلا مقصد پیدا نہیں کی گئیں کیونکہ اللہ کا کوئی کام بھی بلا مقصد اور فضول نہیں ہوتا۔ پھر خود ہی ان لکیروں کا مقصد تجویز کرتے ہوئے پامسٹ حضرات کہتے ہیں کہ ان لکیروں کو اس لیے بنایا گیا ہے تا کہ ان کے ذریعے ماضی، مستقبل اور قسمت و تقدیر کے بارے میں معلوم کر لیا جائے۔

دست شناس حضرات کے اس استدلال سے یہاں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہاتھوں کے خطوط اور اُبھار انسانی قسمت کے رموز و اشارات ہیں تو جسم کے دیگر حصوں پر موجود خطوط اور لکیروں سے یہ

کام کیوں نہیں لیا جاتا؟ مثلاً پاؤں پر بھی خطوط ہوتے ہیں، دست شناس ان سے کیوں نہیں کام لیتے ؟ کیا دست شناسوں کے نزدیک پاؤں کے خطوط، لکیریں اور ابھار، اللہ تعالیٰ نے بلا مقصد پیدا کیے ہیں؟

کوئی پتہ نہیں کہ بیوقوف آئندہ زمانے میں 'ماہر دست شناس' کی جگہ 'ماہر قدم شناس' اور 'ہاتھ بولتے ہیں' کی جگہ 'پاؤں بولتے ہیں' کے بورڈ بھی آویزاں کر لیں اور جس طرح انہوں نے 'دست شناسی' میں تخمینے اور اندازے قائم کر رکھے ہیں اسی طرح 'قدم شناسی' کے نام سے پاؤں کے خطوط اور لکیروں کو بھی انسانی قسمت کا 'راز داں' قرار دینا شروع کر دیں۔ بلکہ سنا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ کام بھی شروع کر دیا ہے!

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کسی چیز کو بھی بلا مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض چیزوں کی حکمتیں اور مقاصد ہمیں معلوم کروا دیے ہیں اور بعض ہم سے مخفی رکھے گئے ہیں۔ ہاتھوں کی لکیریں او خطوط بھی انہی امور سے تعلق رکھتے ہیں جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ البتہ اگر غور کیا جائے تو ان کی کئی ایک فیزی کلی (Physically) حکمتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً ہاتھ سے جس طرح کے کام لیے جاتے ہیں، ان میں اسے بار ہا کھولنا اور بند کرنا پڑتا ہے اور ہاتھوں کی لکیریں اس مقصد کے لیے کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔

دست شناسی جھوٹ، فریب اور کبیرہ گناہ!

گزشتہ نصف صدی میں دست شناسی کے حوالے سے بے شمار کتابیں مارکیٹ میں آئی ہیں جن میں ہاتھوں کی لکیروں اور ابھاروں کے ساتھ مال و دولت، مرض وصحت، فرحت ومسرت، شادی وطلاق، خوش بختی و بدبختی وغیرہ جیسے غیبی اور تقدیر سے متعلقہ معاملات کو اپنے زعم باطل میں قطعی طور پر مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نشاندہی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فلاں فلاں خطوط اور اُبھار فلاں فلاں معاملات کے لئے یقینی اور حتمی علامتوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ سب جھوٹ اور فریب ہے اور ایک لحاظ سے کبیرہ گناہ بھی۔ اس کے جھوٹا ہونے کے ہمارے پاس تین طرح کے دلائل ہیں جو ذیل میں بالترتیب پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱)......پہلی دلیل

اگر انسانی ہاتھ کی لکیروں، خطوط اور اُبھاروں میں ہی انسانی قسمت اور تقدیر مخفی ہوتی تو اسلامی شریعت اس

کی طرف ضرور ہماری رہنمائی کرتی لیکن پورے قرآن مجید اور مکمل ذخیرہ اَحادیث میں ایسی کوئی ایک آیت یا حدیث دکھائی نہیں دیتی جس میں دست شناسی کے حصول کی رغبت یا اس کے فائدے کی طرف کوئی اشارہ ہی ملتا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعینِ عظامؒ، محدثین و مفسرین کرامؒ میں سے کسی ایک شخصیت کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے کسی کا ہاتھ دیکھ کر یا اپنا ہاتھ دکھا کر کسی غیبی معاملے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس لئے اگر دست شناسی واقعی کوئی شرعی اور مستند علم ہوتا تو کم از کم نبیوں کے سردار پیغمبر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو اس سے ہرگز محروم نہ رکھا جاتا......!

۲)......دوسری دلیل

دست شناسی کوئی مشاہداتی، تجرباتی یا سائنسی علم بھی ہرگز نہیں کیونکہ مشاہداتی علم وہ ہوتا ہے جس میں ہر بار مشاہدہ و تجربہ ایک ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ اگر ایک جیسی خاصیات کی حامل مختلف چیزوں کے بارے میں سو تجربات کیے جائیں اور ان میں سے ایک بھی اپنے اصولوں اور نتیجوں سے ہٹ جائے تو اسے سائنسی علم قرار نہیں دیا جاتا۔

اس لحاظ سے اگر جائزہ لیا جائے تو دست شناسوں کی تضاد بیانیاں ہی یہ واضح کر دیتی ہیں کہ ان کا علم محض اندازوں اور تخمینوں پر مبنی ہے اور اس میں دو جمع دو، برابر چار، والی کوئی بات نہیں۔ پامسٹ حضرات کے پاس جانے اور پامسٹری سے متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکارا کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو کسی پامسٹ کا بیان سو فیصد دوسرے پامسٹ سے ملتا ہے اور نہ ہی پامسٹری پر لکھنے والے کسی ایک مصنف کی باتیں دوسرے سے میل کھاتی ہیں بلکہ بہت سی باتیں تو واضح طور پر متضاد اور متناقض ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مثال ملاحظہ ہو۔

چوکور ہاتھ کے بارے میں ایک دست شناس صاحب رقمطراز ہیں کہ

''یہ ہاتھ ایک موجد اور مشین ایجاد کرنے والے کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ سائنس اور انجینئرنگ ان کا شعبہ ہوتا ہے اور وہ سفر اور سرگرمی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور وہ عام طور پر مستقل دوست نہیں بناتے لیکن ان کی محبت دلچسپی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس ہاتھ والی عورتیں ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں''۔ (۱)

۱۔ ہاتھ کی لکیریں، از: معظم جاوید، ص ۳۱۔

جبکہ ایک دوسرے صاحب اسی قسم کے ہاتھ کے بارے میں یوں غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں کہ

''ایک چوکور ہاتھ کا مالک جنسی زندگی میں یکسانیت پسند ہوگا۔ ہر روز بار بار ایک ہی وقت، ایک ہی طریقہ کا اصول اس کے ہاں کارفرما ملتا ہے۔ یہ شخص محبت میں مستحکم ہوتا ہے۔ ناجائز تعلقات قائم نہیں کرتا۔ اگر کسی عورت کے شوہر کا ہاتھ چوکور ہو تو اسے چاہئے کہ وہ وقت پر کھانا دینا اور ایک تنظیم اور ضابطہ اپنا لے اور اسے کسی معاملے میں انتظار نہ کرائے''۔ (۱)

ایک ہی قسم کے ہاتھ کے بارے میں ان دونوں دست شناسوں کے بیانات کو بار بار پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ایک ہی نگاہ ڈالنے سے ان دونوں بیانات میں تناقض ظاہر ہو جائے گا کہ پہلے 'دست شناس' کے بقول ایسے شخص کی زندگی میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور وہ عام طور پر مستقل دوست نہیں بناتا جبکہ دوسرے 'غیب دان' کے بقول ایسا شخص اپنے اصول وضوابط میں پکا اور دوٹوک ہوتا ہے یعنی کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتا بلکہ ایسے شخص کی بیوی کو بھی نصیحت کی جارہی ہے کہ وہ اس کے نظم وضبط کو ڈسٹرب نہ کرے!!

اب بتائیے یہ تضاد اور تناقض نہیں تو تضاد اور تناقض کس بلا کا نام ہے......؟!

اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے کہ دست شناسی جھوٹ اور تکے بازی کا مرکب ہے، آپ ملک کے چند بڑے دست شناس حضرات کے پاس یکے بعد دیگرے حاضر ہوں اور اپنا ہاتھ دکھا کر معلومات حاصل کریں۔ راقم دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک طرف تو ان 'غیب دانوں' کی اکثر وبیشتر باتیں اور پیش گوئیاں تقریباً جھوٹی ہی نکلیں گی اور دوسری طرف ان میں سے کسی ایک 'ماہر دست شناس' کا بیان بھی دوسرے دست شناس سے من وعن مطابقت نہیں رکھتا ہوگا۔ یہاں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔

پاکستان کے ایک شہری جو کاروبار وغیرہ کے سلسلہ میں ایک مغربی ملک میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں، نے میری کتاب ''عاملوں، جادوگروں اور جنات کا پوسٹمارٹم'' پڑھنے کے بعد مجھ سے رابطہ کیا کہ میں آج کل پاکستان میں ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میں گزشتہ پچیس (۲۵) برس سے روحانی عملیات سے وابستہ ہوں اور مختلف ماورائی علوم کے ساتھ دست شناسی کے بارے میں جتنا لٹریچر میں نے پڑھا ہے، اتنا کسی بڑے سے بڑے دست شناس نے بھی کم ہی پڑھا ہوگا۔ پھر روحانیت کے حوالے سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ کہنے لگے کہ میں کم وبیش بیس سال

۱۔ پامسٹری، از اے، ایس، صدیقی، ص ۱۱۹۔

سے ماہر دست شناس کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔اس پیشے سے میں نے بہت دولت اور شہرت پائی ہے۔اب میں پیشے کی حیثیت سے اسے چھوڑ چکا ہوں، تاہم شوق کے طور پر ابھی بھی دست شناسی سے دلچسپی رکھتا ہوں۔

انہوں نے صاف طور پر بتایا کہ دست شناسی کوئی سائنٹیفک علم نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد مشاہدے اور تکے بازی پر ہے اور میرے اپنے تکے بھی ساٹھ فیصد تک کام کرتے ہیں۔اس لیے اس سلسلہ میں قرآن کی بات حتمی ہے کہ غیب کا علم اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔اور جو نجومی یا دست شناس یہ دعویٰ کرے کہ میں ماضی اور مستقبل کی غیبی باتیں سو فیصد یقین سے معلوم کر لیتا ہوں، وہ سراسر جھوٹا اور فریبی ہے۔یہی بات ان دنوں P.T.V پر ایک اور دست شناس بھی کر رہا تھا جو ماہر نفسیات بھی ہے۔اس کا ٹی۔وی انٹرویو بعد میں اخبارات میں بھی شائع ہوا۔اس کے تراشے میرے پاس محفوظ تھے لیکن اتفاق کہ اس وقت وہ میری کتابوں کے ذخیرے میں کہیں دفن ہیں، اس لیے اس سے کوئی اقتباس نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ مذکورہ صاحب سے گفتگو کے آخر میں، میں نے ان سے کہا کہ آپ میرا ہاتھ دیکھ کر اپنی معلومات کا اظہار کریں۔میں نے یہ اس لیے کہا کہ وہ شخص ابھی بھی دست شناسی کے حوالے سے یہ سوچ رکھتا تھا کہ یہ علم مشاہدات پر مبنی ہے اور مستقبل کی باتیں تو اس سے کم معلوم ہوتی ہیں، تاہم ماضی اور انسانی کردار کے حوالے سے اس سے بہت سے باتیں معلوم بھی کی جا سکتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ دو گھنٹے کی تفصیلی وتعارفی نشست کے باوجود یہ میرے بارے میں کئی باتیں غلط ہی بتائے گا اور اس طرح اس کی جب غلطی واضح ہو جائے گی تو شاید دست شناسی کے حوالے سے اس کے جو شکوک وشبہات ابھی باقی ہیں، وہ دور ہو جائیں اور میں اسے صحیح اسلامی نقطہ نظر پر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

میرا ہاتھ دیکھنے کے بعد انہوں نے تین طرح کی پیش گوئیاں کیں۔ایک تو میرے ماضی کے بارے میں، ایک مستقبل کے بارے میں اور ایک سیرت وکردار کے بارے میں۔ مستقبل کی پیش گوئیوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جو آئندہ پانچ سال سے پہلے سے تعلق رکھنے والی ہو، اس لیے اس کے بارے میں انہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔تاہم ماضی اور سیرت وکردار کے حوالے سے انہوں نے جتنی باتیں بیان کیں، ان میں سے زیادہ تر غلط ہی تھیں اور جو تھوڑی بہت صحیح تھیں وہ صرف کردار، ذہانت وغیرہ کے بارے میں تھیں اور میں پورے شرح صدر سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اس لیے صحیح تھیں کہ دو گھنٹے کی نشست میں ان

حوالے سے انہوں نے میری کئی باتیں نوٹ کرلی تھیں۔ اگر شروع ہی میں وہ ہاتھ دیکھتے تو اس حوالے سے بھی ان کے اکثر تکے غلط ہی ثابت ہوتے۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ دست شناسی تکے بازی کا کھیل ہے اور تکے بازی، اٹکل پچو وغیرہ کو قرآن مجید نے نہایت ناپسند کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ [سورۃ الاسراء: ٣٦]

''جس چیز کا تمہیں علم نہیں، اس کے پیچھے نہ پڑو۔''

اب اس کے باوجود کوئی شخص ایسی چیز کے پیچھے پڑتا ہے تو گویا وہ اس قرآنی حکم کی صاف خلاف ورزی کر رہا ہے۔

۳)......تیسری دلیل

یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ دست شناسی اور پامسٹری کے ذریعے مختلف غیبی معاملات پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے اور لوگوں کی موت و حیات، سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی وغیرہ جیسے غیبی امور بتانے اور مستقبل بینی کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے۔ اب ہم قرآن و سنت کے حوالے سے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی 'غیب دان' ہو سکتا ہے؟ اور نیز ایسے لوگوں کے پاس جانے، اپنا ہاتھ دکھانے اور ان جھوٹے دست شناسوں، نجومیوں، کاہنوں اور عاملوں کو سچا تسلیم کرنے والے شخص کے بارے میں ہمارا دین ہمیں کیا بتاتا ہے؟

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی غیب دان نہیں۔ بطور مثال چند ایک آیات ملاحظہ ہوں:

(۱)...... ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [سورۃ النمل: ٦٥]

''کہہ دیجئے کہ آسمان والوں اور زمین والوں میں سے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی غیب نہیں جانتا، اور یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

(۲)...... ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ﴾ [سورۃ الانعام: ٥٩]

''اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے''۔

(۳)...... ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

''بے شک قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ وہ بارش نازل کرتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے وہ جانتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس جگہ مرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی علم وخبر والا ہے''۔ [سورۃ لقمان:۳۴]

(٤)...... ﴿قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [سورة الاعراف: ١٨٨]

''(اے نبیؐ!) آپ فرمادیں کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب دان ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو محض اہلِ ایمان کو (جہنم سے) ڈرانے والا اور (جنت کی) خوشخبری دینے والا ہوں''۔

(٥)...... ﴿قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ [سورة الانعام: ٥٠]

''(اے نبیؐ!) آپ فرمادیجئے کہ میں اس چیز کا دعویدار نہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں بلکہ میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے''۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے ہر ایسے شخص کے پاس جانے سے منع فرمادیا ہے جو غیب دانی کا کسی طرح بھی مدعی ہو۔ اس سلسلہ میں چند ایک احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱)...... ((عَنْ صَفِيَّةَ عَنْ بَعْضِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهٗ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهٗ صَلَاةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً))

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی کسی زوجہ مطہرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ

نے فرمایا: جو شخص کسی عراف (کاہن رنجومی رپامسٹ وغیرہ) کے پاس آیا اور اس سے کسی (غیبی) چیز کے متعلق سوال کیا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوتی''۔(١)

(٢)...... ((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَتٰی كَاهِناً اَوْ عَرَّافًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ))

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی کاہن یا عراف کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی تو گویا اس نے اس چیز (دین) کا کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی''۔(٢)

(٣)...... ((عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الانصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِیِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ))

''حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کے (کاروبار)، زانیہ کی کمائی اور کاہن کی شیرینی (کمائی) سے منع فرمایا ہے''۔(٣)

(٤)...... ((عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ اَوْ تُطُيِّرَ لَهُ اَوْ تَكَهَّنَ اَوْ تُكُهِّنَ لَهُ اَوْ سَحَرَ اَوْ سُحِرَ لَهُ وَمَنْ عَقَدَ عُقْدَةً وَمَنْ اَتٰی كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا قَالَ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ))(٤)

''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو بدفالی لے یا اس

١۔ مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکہانة و اتیان الکھان، ح ٢٢٣٠۔ احمد، ج ٤ ص ٦٨۔ حلیة الاولیاء، ج ١٠ ص ٤٠٦۔ بیہقی، ج ٨ ص ١٣٨۔ المعجم الاوسط، ح ١٤٢٤۔ مجمع الزوائد، ج ٥ ص ١١٨۔

٢۔ مسند احمد، ج ٢ ص ٤٢٩۔ مستدرک حاکم، ج ١ ص ٨۔ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ طحاوی، ج ٣ ص ٤٤۔ ارواء الغلیل، ج ٥ ص ٦٩۔ شیخ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

٣۔ مسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم ثمن الکلب وحلوان الکاھن ومھر البغی ...، ح ١٥٦٧۔ نیز دیکھیے: بخاری، کتاب الطب، ح ٥٧٦١۔

٤۔ المعجم الکبیر للطبرانی، ج ١٨ ص ٣٥٥۔ مسند بزار، ح ٣٠٤٣۔ ح ٣٠٤٤۔ مجمع الزوائد، ج ٥ ص ١١٧۔ امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں: "ورجالہ رجال الصحیح خلا اسحاق بن ربیع وھو ثقة" اسے بزار نے روایت کیا اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے اسحاق بن ربیع کے البتہ وہ بھی ثقہ راوی ہے''۔

کے لیے بدفالی کا عمل کیا جائے یا جو شخص کاہن بنے یا اس کے لیے کہانت کا عمل کیا جائے یا جو جادو کرے یا جادو کروائے یا گرہ لگائے ایسے لوگوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں اور جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے''۔

(۵)...... ((عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ ؓ قَالَ: مَنْ أَتٰى عَرَّافًا أَوْ سَاحِرًا أَوْ كَاهِنًا فَسَأَلَهُ فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ)) [۱]

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی عراف، جادوگر یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی''۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ دست شناسوں، عاملوں، عرافوں، کاہنوں، نجومیوں، جوتشیوں، جوگیوں، پروفیسروں، سادھوؤں، بنگالی بابوؤں وغیرہ کے پاس جانا اسلام میں سخت منع کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس جانے والوں اور ان پر یقین رکھنے والوں کا ایمان بھی خطرے میں رہتا ہے اور پھر حقیقت بھی یہ ہے کہ انسانی تقدیر اور قسمت معلوم کر لینے کے حوالے سے ان کے پاس کوئی علم بھی نہیں۔ دوسری طرف ایسے تمام نام نہاد عاملوں اور دست شناسوں کی کمائی بھی حرام کی کمائی ہے۔ اس لیے انہیں بھی سنجیدگی سے اپنے اس پیشہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائے، آمین۔

اللھم اھدنا الصراط المستقیم (آمین یا رب العالمین!)

......☆......

۱۔ المعجم الکبیر، للطبرانی، ج ۱۰ ح ۱۰۰۰۵۔ مسند ابی یعلی، ج ۹ ح ۵۴۰۸۔ مسند بزار، ج ۵ ۳۰۴۵۔ مجمع الزوائد، ج ۵ ص ۱۱۸۔ وقال رجال الکبیر والبزار ثقات۔

۲۔علمِ جفر، عدد، اَسرارُ الحروف اور انسانی قسمت

دراصل یہ تمام علوم مختلف حروف تہجی (خواہ اردو حروف تہجی ہوں یا عربی یا انگریزی یا ہندی یا لاطینی وغیرہ) اور مختلف عددوں مثلاً ۱، ۲، ۳ یا 1,2,3 وغیرہ کے گرد گھومتے ہیں۔ان میں سے بعض کا تعلق ان حروف کے مخفی اسرار سے بتایا جاتا ہے (اگرچہ یہ صاف جھوٹ ہے جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آرہی ہے) اور بعض کا تعلق محض گنتی کے استعمال سے، خواہ گنتی کا یہ استعمال ظاہری طور پر ہو یا رموزی (رمزی) طور پر۔ اس لحاظ سے علم جفر، علم اسرار الحروف اور علم سیمیا تو تقریباً مترادف المعنی ہیں جب کہ 'علم عدد' (یا علم ابجد وغیرہ) ان سے جدا ہے۔علاوہ ازیں اعداد کو رموز اور شعار وغیرہ کے لئے استعمال کرنا صحیح ہے جبکہ انہی اعداد اور حروف کو انسانی قسمت کے لیے مؤثر سمجھ کر تعویذ گنڈے، شگون اور فالنامے وغیرہ کے لئے استعمال کرنا غلط اور ناجائز ہے۔اب آئندہ سطور میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

علم جفر

حاجی خلیفہ 'علم جفر' کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ

''اس سے مراد لوحِ محفوظ (یعنی تقدیر) کے اس علم کا حصول ہے جس میں ماضی اور مستقبل کی جزوی اور کلی معلومات درج ہیں۔بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بسط اعظم کی ترتیب سے ایک چمڑے (جفر) پر اٹھائیس (28) حروف لکھے اور ان حروف سے مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ ایسے الفاظ نکالے جو تقدیر کا راز مہیا کرتے ہیں اور پھر یہی علم اہل بیت اور ان سے محبت کرنے والوں کو ورثہ میں حاصل ہوا اور اہل بیت اس علم کو دوسرے لوگوں سے چھپا کر رکھتے ہیں۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان حروف کے اَسرار و رُموز کو مہدیِ منتظر (شیعوں کے بقول ان کا بارہواں امام جو کسی غار میں چھپ گیا تھا اور قیامت کے قریب ظاہر ہوگا) کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔[۱]

معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے ہاں علم جفر سے مراد 'حروف' کا ایسا علم ہے جس میں حروف کے مخفی اَسرار کے

۱۔ کشف الظنون، ج ۱ ص ۵۹۱۔

ساتھ تقدیر کی بابت معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ [۱]

اور جن لوگوں نے اسے 'علم جفر' قرار دیا، ان کے نزدیک اسے 'علم جفر' اس لئے کہا جاتا ہے کہ
''حضرت علیؓ نے سب سے پہلے ان حروف کو جفر (یعنی چمڑے) پر لکھا تھا''۔ [۲]

علم جفر کے حوالے سے اردو دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ

''ایک عددی علم ہے جس میں مخفی معانی کی مدد سے واقعات، خصوصاً آنے والے واقعات کی تعبیر یا ان کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔ یہ کشفی یا باطنی روایت بعض خاص حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی۔ خلافت کے لئے بعض حلقوں کی سرتوڑ کوشش کے دوران میں جو ابتداء ہی سے باہمی اختلافات سے کمزور ہو گئے تھے اور بالخصوص المتوکل کے عہدِ خلافت میں سخت جبر و تشدد کا شکار بنے رہے۔ ۲۳۷ھ/۵۱ء میں ایک کشفی اور اِلقائی ادب کا آغاز ہوا۔ یہ ادب مختلف شکلوں میں منظر عام پر آیا جس پر بحیثیتِ مجموعی جفر کے اسم کا عام اطلاق ہوتا ہے۔ اکثر اس کے ساتھ اسم جامعہ یا صفت جامع کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جفر کا رجحان مافوق الفطرت اور کائناتی پیمانے پر رؤیت عالم کی طرف ہے۔ اپنی ابتدائی صورت میں اِلہامی نوعیت کے ایسے علم باطنی سے ہٹ کر جو ائمہ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وارثوں اور جانشینوں سے مخصوص تھا، اب یہ پیشگوئی کے ایک ایسے طریق کار سے منسوب ہونے لگا جس تک ہر حسب و نسب کے معقول آدمی خصوصاً صوفیاء حضرات کی رسائی ہو سکے''۔ [۳]

اسی طرح 'الجفر' نامی ایک کتاب بھی اس علم کے حوالے سے لوگوں (بالخصوص شیعہ و صوفیا) میں معروف ہے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فرقہ زیدیہ کے سردار ہارون بن سعید العجلی کے پاس ایک کتاب تھی جس کی اشاعت وہ امام جعفر صادقؒ کی سند پر کیا کرتا تھا اور اس میں مستقبل کی اطلاعات درج تھیں۔ [۴]

ہمارا تبصرہ

مذکورہ اقتباسات سے درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں کہ

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیے: المنجد، لسان العرب، تاج العروس بذیل مادہ جفر۔

۲۔ کشف الظنون، حوالہ مذکور۔

۳۔ اردو دائرۃ المعارف، ج۷ ص ۳۱۱۔

۴۔ دیکھیے: کشف الظنون، ج۱ ص ۵۹۱۔ اردو دائرۃ المعارف، ج۷ ص ۳۱۴۔

۱)..... بعض کے بقول یہ علم حضرت علیؓ سے شروع ہوا جبکہ بعض کے بقول یہ امام جعفر صادقؒ سے شروع ہوا۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک شخصیت تک بھی اس کی کوئی سند یا ثبوت نہیں ملتا، اس لیے یہ کہنا ہی مناسب ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت جعفر صادقؒ کی طرف بعض لوگوں نے اسے از خود منسوب کر دیا ہے۔

۲)..... بعض لوگوں کے بقول ان حروف کے اَسرار کو مہدیٔ منتظر کے سوا کوئی نہیں جانتا جبکہ دیگر لوگوں کے بقول اہل بیت اور صوفیاء اسرارِ حروف کے ماہر ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اول تو اس علم کی کوئی سند نہیں اور دوم یہ کہ گنتی یا لغت کے حروف یا قرآنی حروفِ مقطعات وغیرہ کے بارے میں شریعت نے کوئی اسرار اور راز نہیں بتائے بلکہ ایسا دعویٰ گویا غیب دانی کے دعویٰ کے مترادف ہے اور ایک مسلمان کو اچھی طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ غیب کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور جفر، رمل، نجوم، دست شناسی وغیرہ کی بنیاد پر غیب کا دعویٰ کرنے والے شخص کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی صحیح حدیث ہے کہ

((مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَسَاَلَهُ عَنْ شَیْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً))[۱]

''جو شخص کسی عراف (کاہن) کے پاس آیا اور اس سے کسی (غیبی) چیز کے متعلق سوال کیا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوتی''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اس حدیث کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ

''ہر وہ شخص عراف ہے جو علم نجوم، کہانت، رمل اور اس سے ملتی جلتی کسی ایسی چیز سے عمل کرے جس سے 'غیب' کا علم حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے''۔[۲]

علم الحروف یا علم اَسرار الحروف یا علم سیمیا

یہ تینوں تقریباً مترادف المعنی الفاظ ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف کے مقالہ نگار کے بقول:

''علم الحروف، جفر کی ایک شاخ (ہے) جس کا شروع میں صحیح مفہوم محض ناموں سے فال نکالنا تھا لیکن بعض باطنی فرقوں میں اس نے ایک ساحرانہ عمل کی شکل اختیار کر لی۔ اس حد تک کہ ابن خلدونؒ نے

۱۔ مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکهانة...، ح ۲۲۳۰۔ احمد، ج ٤ ص ٦٨۔ حلية الاولياء ج ۱۰ ص ٤٠٦۔ بيهقي، ج ٨ ص ١٣٨۔ المعجم الاوسط، ح ١٤٢٤۔ مجمع الزوائد، ج ٥ ص ١١٨۔

۲۔ مجموع الفتاوی، ج ١٨ ص ١٠٦۔

اسے سیمیا کا نام دیا ہے جو بالعموم سحر حلال (جادو کی ایک قسم White Magic) کے لئے مستعمل ہے۔ یہ علم حروفِ ہجا، نیز اسماء الحسنٰی اور اسمائے ملائک کے حروف کے سری خواص پر مبنی ہے''۔[1]

آئندہ سطور میں ہم پہلے اعداد اور حروف سے غیب معلوم کرنے کے وہ طریقے بیان کریں گے جو ان علوم کے ماہرین نے بیان کیے ہیں، اس کے بعد اسلامی نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ کریں گے، ان شاء اللہ

عربی حروفِ تہجی کے خواص معلوم کرنے کا طریقہ

اس علم کے دعوے دار حضرات عربی حروف تہجی کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱- آتشی حروف: یعنی ایسے حروف جن کی مدد سے سردی اور ٹھنڈک کو کم کیا جاتا ہے یا مزید گرمائش اور آتش بھڑکائی جاتی ہے۔ اس کے لئے درج ذیل حروف استعمال کیے جاتے ہیں:

ا، ھ، ط، م، ف، ش، ذ، جن کا مجموعہ اھطم فشذ ہے۔

۲- آبی حروف: یعنی ایسے حروف جنہیں ایسی خرابیوں کی پیشگوئی اور مدافعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کا تعلق گرمی سے ہو مثلاً بخار کی مختلف اقسام، نیز سردی کے اثر میں اضافہ کرنے کے لئے جہاں اس کی ضرورت درپیش ہو۔ اس عمل کے لئے عامل حضرات درج ذیل حروف استعمال کرتے ہیں:

ج، ز، ک، س، ق، ث، ظ، جن کا مجموعہ جز کس قثظ ہے۔

۳- بادی حروف: انہیں بھی مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس میں درج ذیل حروف شامل ہیں:

ب، و، ی، ن، ص، ت، ض، ان کا مجموعہ بوین صتض ہے۔

۴- خاکی حروف: اس میں درج ذیل حروف شامل ہیں:

د، ح، ل، ع، ر، خ، غ، جن کا مجموعہ دحل عرخغ ہے۔

اسے بالاختصار درج ذیل جدول سے بھی نمایاں کیا جاتا ہے:

۱- دائرۃ المعارف، ایضاً

نمبر شمار	کواکب	آتشی	بادی	آبی	خاکی
۱	زحل	ا	ب	ج	د
۲	مشتری	ہ	و	ز	ح
۳	مریخ	ط	ی	ک	ل
۴	سورج	م	ن	س	ع
۵	زہرہ	ف	ص	ق	ر
۶	عطارد	ش	ت	ث	خ
۷	قمر	ذ	ض	ظ	غ

عربی حروفِ تہجی کی عددی قیمت

مذکورہ حروفِ تہجی کی عددی قیمت بھی معین کی گئی ہے، اگر چہ اس عددی قیمت میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، تاہم درج ذیل عددی قیمت کو کسی حد تک معیاری خیال کیا جاتا ہے۔

اکائیاں	دہائیاں	سیکڑے	ہزار
الف-1	ی-10	ق-100	غ-1000
ب-2	ک-20	ر-200	
ج-3	ل-30	ش-300	
د-4	م-40	ت-400	
ھ-5	ن-50	ث-500	
و-6	س-60	خ-600	
ز-7	ع-70	ذ-700	
ح-8	ف-80	ض-800	
ط-9	ص-90	ظ-900	

مذکورہ حروف اور ان کی عددی قیمت کے مجموعے کو 'حروفِ ابجد' بھی کہا جاتا ہے۔ اہل عرب نے انہائیس حروفِ تہجی کو نو نو حروں کے تین متواتر سلسلوں میں تقسیم کر رکھا تھا یعنی پہلے سلسلہ میں الف سے ط تک کو اکائیوں کے لئے، دوسرے سلسلہ میں ی سے ص تک دہائیوں کے لئے اور تیسرے سلسلہ میں ق سے ظ تک سیکڑوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ ہزار کے لئے صرف ایک حرف یعنی 'غ' مقرر تھا۔ علاوہ ازیں ان تمام حروف کو درج ذیل مجموعہ جات میں تقسیم کر رکھا تھا:

" ابجد، ھوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ "

یہ اہل مشرق کے وضع کردہ مجموعہ جات ہیں جبکہ اہل مغرب کے وضع کردہ مجموعہ جات اس سے قدرے مختلف ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

" ابجد، ھوز، حطی، کلمن، صعفض، قرست، ثخذ، ظغش "

اہلِ عرب کے ہاں یہ حروف اور ان کے عددی اشارے (یا قیمتیں) روایتی طور پر چلے آتے ہیں جبکہ ان کے آغاز کی تاریخ اور پس منظر قطعی طور پر معلوم نہیں۔ اس سلسلہ میں بعض نے کہا ہے کہ مدین کے چھ بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے ان مجموعہ جات کو اپنے ناموں کے لئے وضع کیا تھا۔ بعض کے بقول یہ مختلف دیوتاؤں کے نام ہیں۔ بعض کے بقول یہ ہفتے کے دنوں کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی توجیہات منقول ہیں لیکن یہ سب افسانوی بیانات ہیں۔

عامل حضرات ان اعداد کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ سائل کا نام، اس کے والد کا نام اور بسا اوقات اس کی تاریخِ پیدائش وغیرہ بھی معلوم کی جاتی ہے پھر اس کے نام کے حروف کی عددی قیمت نکال کر جمع کیا جاتا ہے اور اس کے بعد حسبِ سوال کبھی دو پر کبھی تین یا پانچ یا بارہ پر تقسیم کیا جاتا ہے، پھر تقسیم سے باقی بچنے والے اعداد کے انہوں نے اپنی طرف سے کچھ فرضی جواب مقرر کیے ہوتے ہیں اور وہی جواب سائل کو بتا دیا جاتا ہے۔ گویا کوئی بھی فرضی جواب مقرر کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی حروفِ تہجی سے خواص معلوم کرنے کا طریقہ

علم جفر کے دعوے دار ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے حروفِ تہجی اور اعداد کی مناسبت سے لوگوں کی قسمت، اخلاق و کردار وغیرہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انگریزی میں اس

کے لئے درج ذیل چارٹر استعمال کیا جاتا ہے:

1	2	3	4	5	6	7	8	9
A	B	C	D	E	F	G	H	I
J	K	L	M	N	O	P	Q	R
S	T	U	V	W	X	Y	Z	

یعنی جب بھی A ,J اور S کا عدد نکالنا ہوگا تو وہ '1' نکالا جائے گا۔ اسی طرح T-K-B میں سے کوئی حرف استعمال ہو تو اس کے لئے 2 کا عدد تصور کیا جائے گا۔ اسے سمجھنے کے لئے درج ذیل مثال پر غور کریں:

''فرض کریں کہ ہمیں ایک مشہور نام 'لنڈن بینس جانسن' (LYNDON BAINES JOHNSON) کا عددی ارتعاش معلوم کرنا ہے چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے اس کے مساوی حروف کے مساوی اعداد جمع کیجیے۔ یہ نام درج ذیل طریقے کے مطابق لکھا جائے گا، نیچے مساوی اعداد بھی درج ہیں:

L	Y	N	D	O	N	-	B	A	I	N	E	S	-	J	O	H	N	S	O	N
3	7	5	4	6	5	-	2	1	9	5	5	1	-	1	6	8	5	1	6	5

ان تمام اعداد کو جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ 85 بنتا ہے جسے اگر مختصر کیا جائے یعنی 5+8 تو 13 جمع ہوئے۔ اب اسے مزید مختصر کیا جائے یعنی (3+1) تو چار (4) جواب آیا۔ گویا 'مسٹر جانسن' کا سائیکل نمبر 4 ہے جس سے اس کی زندگی کے ارتعاش یا زیر و بم کا بخوبی پتہ لگایا جا سکتا ہے''۔[1]

گویا اس طرح ہر نام کا اختصار کر کے ایک عدد نکالا جاتا ہے جسے اس شخص کا سائیکل نمبر قرار دیا جاتا ہے اور ان سائیکل نمبروں کی تعداد ایک (1) سے نو (9) تک ہے اور ہر سائیکل نمبر کے تحت اس کی خاصیات یعنی قسمت کا مکمل حال درج کر دیا جاتا ہے اور اسی کا نام 'علم جفر' وغیرہ ہے۔

بیلنس نمبر

بیلنس نمبر، سائیکل نمبر ہی کی مزید اختصاری شکل سے حاصل ہوتا ہے یعنی مذکورہ نام (لنڈن بینس جانسن)

۱۔ پراسرار اعداد، مترجم: اظہر کلیم، ص ۸۔

کے حامل شخص کا بیلنس نمبر اس طرح نکالا جاتا ہے کہ اس کے نام کے تین ٹکڑے کر لئے جائیں یعنی (1) لنڈن (2) بینس (3) جانسن۔ اور ہر ٹکڑے کا صرف پہلا حرف لے کر اس کا نمبر نکالا جائے یعنی لنڈن (LYNDON) کا L بینس (BAINES) کا B اور جانسن (JOHNSON) کا J:

اب ہمیں درج ذیل جواب حاصل ہوا:

L	=	3
B	=	2
J	=	1
+	=	6

پھر سائیکل نمبر ہی کی طرح بیلنس نمبر بھی ایک سے نو (9) تک مقرر ہیں اور ہر ایک بیلنس نمبر میں تقدیر و قسمت اور اخلاق و کردار سے متعلقہ کچھ چیزیں ذکر کر دی جاتی ہیں۔

لکی (قسمت) نمبر

بیلنس نمبر کے علاوہ ایک قسمت نمبر بھی معروف ہے اور اسے نکالنے کا طریقہ بھی ان سے ملتا جلتا بتایا جاتا ہے مثلاً کسی شخص کا قسمت نمبر معلوم کرنا ہو تو اس کی مکمل تاریخِ پیدائش معلوم کریں مثلاً کسی شخص کی تاریخِ پیدائش اگر 27 اگست 1908 ہے تو اب یہ دیکھئے کہ اگست سال کا کون سا مہینا ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ آٹھواں مہینا ہے لہٰذا:

مہینا	=	8
تاریخ	=	27
سال	=	1908
اعداد کا مجموعہ	=	1943

اب ان اعداد کو پہلے ہی کی طرح جمع کریں یعنی:

17=3+4+9+1

اور 17 کو مزید مختصر کیا یعنی

8=1+7

تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کا قسمت نمبر 8 ہے۔

پھر بیلنس اور سائیکل نمبر کی طرح قسمت نمبر بھی 1 سے 9 تک ہیں جن میں ہر قسمت کے نمبر کے تحت قسمت کا حال درج کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح 'ماہانہ نمبر'، 'سالانہ نمبر'، 'خوش نصیبی نمبر'، 'زندگی کا سپیشل نمبر' وغیرہ جیسے کئی اور نمبر بھی مقرر کئے گئے ہیں اور ان میں بھی ایک سے نو تک مختلف اعداد نکال کر ان سے 'لوحِ محفوظ' دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے...!

از راہِ اختصار اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اب ہم ان نمبروں کا شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں:

ہمارا تبصرہ

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس علم میں واضح طور پر 'غیب' جاننے کی کوشش کی جاتی ہے اور قرآن و سنت میں وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی غیب دان نہیں''۔

۲۔ قرآن وسنت میں کہیں بھی اس علم کی مذکورہ افادیت بیان نہیں کی گئی بلکہ اگر اس علم کی واقعی کوئی ایسی وقعت اور حیثیت ہوتی تو آنحضرت ﷺ اپنے سفر، جہاد، دعوت وتبلیغ وغیرہ جیسے ہر اہم کام میں اسے بروئے کار لاتے جب کہ آپ ﷺ کی زندگی سے بلکہ صحابہ کرام، تابعین عظام، محدثین ومفسرین کرام وغیرہ میں سے بھی کسی شخصیت سے ایسی کوئی بات منقول نہیں۔

۳۔ اگر اس طرح کے علوم سے تقدیر کا پیشگی علم حاصل کیا جا سکتا ہوتا تو ہمیں بار بار تقدیر پر ایمان لانے اور اس پر صبر کرنے کی تلقین نہ کی جاتی بلکہ اس کے برعکس ایسے کسی علم کے حصول کی رغبت دلائی جاتی تاکہ ہم اپنی زندگی میں تمام معاملات کو پیشگی معلوم کر کے اس علم سے فائدہ اٹھاتے۔

۴۔ اگر یہ کوئی حتمی اور قطعی علم ہوتا تو کم از کم اس علم کے دعوے داروں میں اختلاف اور تضاد نہ ہوتا لیکن اس علم پر مشتمل کتابیں پڑھنے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی عدد کے خواص ایک صاحب کے نزدیک کچھ اور ہیں اور دوسرے صاحب کے نزدیک کچھ اور۔

۵۔ بعض اوقات تو ایک ہی مصنف کی باتوں میں مطابقت دکھائی نہیں دیتی۔ ایک شخص کے قسمت نمبر میں [illegible] خصوصیت دکھائی جاتی [illegible] خوش قسمتی نمبر میں اس کے برعکس۔ جبکہ قسمت اور خوش قسمتی [illegible]

کوئی ایسا بڑا فرق نہیں کہ انہیں جدا جدا بیان کیا جائے۔ اسی طرح سائیکل نمبر، بیلنس نمبر اور قسمت نمبر وغیرہ تمام کا تعلق تقدیر سے ہے لیکن انہیں الگ الگ نمبروں اور خاصیتوں میں بیان کیا جاتا ہے حالانکہ ہر شخص کی ایک ہی 'تقدیر' ہے جو پیدائش سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے طے کر رکھی ہے جب کہ 'پراسرار حروف' کے دعوے داروں کے نزدیک انسان کی کئی الگ الگ تقدیریں دکھائی دیتی ہیں۔

۶۔ اس پر بھی طرفہ تماشا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا 'قسمتی نمبر' برا ہو تو وہ اپنا نام تبدیل کر لے اور اس طرح نام کی تبدیلی سے اس کا 'قسمت نمبر' بھی تبدیل ہو جائے گا حالانکہ یہ چیز محال ہے اس لئے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اسے اللہ تعالیٰ کے سوا دنیا کی کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ [الرعد: ۲۸،۲۹]

''ہر مقررہ چیز کی مدت لکھی جا چکی ہے، اللہ تعالیٰ جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہے قائم رکھتا ہے اور لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے''۔

۷۔ یہ بات اس طرح بھی ناممکن ہے کہ اگر ان حروف کے ساتھ ہر شخص اپنی تقدیر کا حال معلوم کر سکتا ہو تو دنیا میں کوئی بدقسمت اور دکھوں، تکلیفوں کا شکار دکھائی ہی نہ دے گا بلکہ ہر شخص ایسا نام رکھنے کی کوشش کرے گا جس کے عدد خوش قسمتی کی علامت ہوں تاکہ اس طرح وہ خوش قسمت بن سکے۔

۸۔ اگر کسی عدد میں 'بادشاہ' یا حاکم ملک بنانے کی تاثیر ہو تو پھر ہر شخص ہی بادشاہ اور حاکم بننے کی کوشش کرے گا۔ اب بتائیے کہ اگر بالفرض صرف ایک ملک میں 100 آدمی بادشاہ/حاکم بننے کے لئے اپنا نام اس عدد کے مطابق کر لیں تو ان میں سے بادشاہ/حاکم کون بنے گا؟

۹۔ اس علم پر یقین کرنے والے بھی عجیب احمق ہیں کہ یہ ایسے لوگوں کو جن کا عدد ناموافق ہو، ہر دم احتیاط کی تاکید کرتے ہیں حالانکہ اگر ان کے بقول نام کی تبدیلی سے عدد کی تبدیلی اور عدد کی تبدیلی سے قسمت کی تبدیلی ممکن ہے تو پھر یہ 'احتیاط' کی نصیحت کیوں فرماتے ہیں؟ انہیں چاہیے کہ نام کی تبدیلیاں کر کے لوگوں کی قسمتوں کو تبدیل کرتے رہیں بلکہ پھر تو بغیر کسی خرچ کے ہر بدقسمت گھر بیٹھے خود ہی خوش قسمت بن جانا چاہیے، بیمار کو خود ہی اپنے نام کی تبدیلی سے صحت حاصل کر لینی چاہیے۔ اس طرح نہ کسی ڈاکٹر و حکیم کی ضرورت رہے گی نہ کسی ہسپتال کی۔ نہ محافظوں، سپاہیوں اور فوج کی ضرورت رہے گی، نہ محنت مزدوری اور کام کاج کی۔ بلکہ پھر تو نہ دنیا میں کوئی پریشانی رہے اور نہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی ضرورت

رہے، معاذ اللہ!

۱۰۔ حروف کی تاثیر کے قائلین کے نزدیک علم جفر کی مدد سے عملیات کے لئے بسا اَوقات تاریخِ پیدائش کا جاننا ضروری ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی تاریخِ پیدائش یاد نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے گا؟ کیونکہ بہت سے لوگوں کو اپنی تاریخِ پیدائش یاد نہیں ہوتی (اگرچہ بعض نام نہاد عاملوں نے اس کے بھی کئی من گھڑت طریقے وضع کر رکھے ہیں لیکن ان کی بھی کوئی حقیقت نہیں)

حروفِ ابجد کا درست استعمال

یہ تو ثابت ہو چکا کہ کسی حرف یا عدد میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کے ذریعے کسی انسان کی قسمت، اَخلاق یا مستقبل کے غیبی حقائق معلوم کیے جا سکیں البتہ اگر ان حروف اور اعداد کو مختلف رموز، کنائے اور اشارہ جات یعنی کوڈورڈ (Code Word) کے لئے استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں مثلاً حروفِ اَبجد ہی سے یہ بات سمجھیے کہ بعض اساتذہ امتحانی نمبر لگانے کے لئے طالب علم کا امتحان لیتے ہوئے اس کے سامنے اس کے نمبر لگا دیتے ہیں لیکن اس طالب علم کو بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ میرے نمبر کتنے ہیں کیونکہ استاد حروفِ ابجد کے ذریعے نمبر لگاتا ہے اور شاگرد حروفِ ابجد کے استعمال کو نہیں جانتا مثلاً کسی طالب کے نمبر اگر بیاسی (82) لگانے ہوں تو 82 کی جگہ استاد، ف اور ب (فب) ڈال دے گا کیونکہ ف کی عددی قیمت اسی (80) اور ب کی دو (2) ہے۔

اسی طرح جنگوں میں بعض ایسے کلمات، حروف اور اَعداد استعمال ہوتے ہیں جنہیں صرف مخصوص افراد ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ دوسرے لوگوں کے سامنے وہ محض کوئی حرف، عدد یا عام لفظ ہے لیکن اسے پہچاننے والے ان کے ذریعے مخصوص لوگوں تک اپنا کوئی پیغام پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآنِ مجید میں حروفِ رموز واَوقاف استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً ج، ز، ط، لا، وغیرہ اور ان کا مقصود قرآنِ مجید کے ابتدائی یا آخری صفحات میں ذکر کر دیا جاتا ہے کہ 'ج' وقف جائز کی علامت ہے..... 'ط' وقف مطلق کی علامت ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ گویا ان قواعد کو ایک ہی مرتبہ لکھ دیا جاتا ہے اور جہاں کہیں ان میں سے کسی قاعدے اور اصول کا اطلاق ہو، وہاں اس سے متعلقہ رمز یہ حرف، ج، ز، ط، وغیرہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایسا اختصار کے لیے کیا جاتا ہے اور شرعی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں۔

حروفِ ابجد کے استعمال کی ایک ناجائز صورت

بعض لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم مکمل لکھنے کی بجائے اس کے اعداد نکال کر فقط (۷۸۶-786) لکھ دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی کاغذ پر پوری بسم اللہ لکھ دی جائے تو عین ممکن ہے کہ اس کاغذ کو ردی کی ٹوکری یا زمین وغیرہ پر پھینک دیے جانے سے بسم اللہ کی توہین ہو، لہٰذا اس توہین سے بچنے کے لیے بسم اللہ کے اعداد یعنی '۷۸۶' لکھنے چاہییں۔ حالانکہ یہ بھی بسم اللہ کی توہین ہے کہ اسے اصل حالت میں لکھنے کی بجائے اس طرح اعداد کی صورت میں لکھا جائے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی سنت سے یہی ثابت ہے کہ آپؐ نے جب بھی خطوط لکھوائے ان پر پوری بسم اللہ تحریر کروائی اور ایسے کئی خطوط کافر بادشاہوں کی طرف بھی روانہ کئے گئے بلکہ ایران کے بادشاہ (کسریٰ) 'خسرو پرویز' کا تو واقعہ مشہور ہے کہ اس بدبخت نے آپ ﷺ کا نامہ مبارک چاک کر دیا تھا۔ اگرچہ حضور نبی اکرم ﷺ کو بھی اندیشہ ہوگا کہ کہیں کوئی کافر بسم اللہ کی توہین نہ کرے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے بسم اللہ کی جگہ اعداد وغیرہ کبھی نہیں لکھوائے جبکہ آپؐ کے عہد مبارک میں عرب کے ہاں اعداد کا طریقہ بھی مروج تھا۔ اس لئے قرآنی آیات اور مسنون وظائف و اوراد کو من وعن اسی طرح پڑھا لکھا جائے جس طرح کہ یہ قرآن وحدیث کی صورت میں محفوظ ذرائع کے ساتھ ہم تک منتقل ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں بعض اہل علم کے بقول بسم اللہ کو ۷۸۶ (786) کی عددی صورت میں لکھنا ہندووانہ اثرات کا نتیجہ ہے، اس لئے کہ ہندوؤں کے ایک معبود کرشن کے نام کا نعرہ 'ہرے کرشنا' ہے اور اس کے اعداد کا مجموعہ بھی 786 ہے۔ اور اسی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اعداد کا مجموعہ بھی 786 بنتا ہے۔ گویا ہندو 786 لکھ کر 'ہرے کرشنا' سے فریاد رسی کرتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو ان کے اس شرکیہ مذہبی شعار کی مشابہت سے بہرصورت بچنا چاہیے۔ باقی رہا بسم اللہ لکھی تحریر کی بے حرمتی کا مسئلہ تو اس کے لیے کوئی معقول حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔ اللہ ہمیں ہدایت دے، آمین!

......☆......

۳۔علم نجوم/ASTROLOGY اور انسانی قسمت

سورج، چاند اور ستارے دیگر مخلوقات کی طرح، اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ اجرام فلکی ہیں۔ دیگر اشیاء کی طرح انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے خاص مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے مثلاً مختلف ستاروں کی مدد سے سمت اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ سورج سے روشنی اور حرارت حاصل کی جاتی ہے۔ چاند کے ذریعے بھی وقت اور تاریخ کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سمندروں کے مدوجزر اور پھلوں کی مٹھاس وغیرہ میں دیگر عوامل کی طرح چاند بھی ایک مؤثر عامل بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اجرام فلکی سے آسمان کی زیب و زینت اور شیطانوں کو مار بھگانے کے لیے ہتھیار کا کام بھی لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے اجرامِ فلکی کی رفتار و حرکات کے ساتھ مندرجہ بالا چیزوں کو مربوط کر رکھا ہے اور جب انسانوں نے ان سیاروں اور ستاروں کی حرکات کا بغور مشاہدہ کرنا شروع کیا تو انہوں نے انسانی تاریخ کے آغاز ہی میں دن رات کا فرق، دنوں کی تقسیم، ماہ و سال کا اندازہ، سمتوں کا تعین، موسموں کی تقسیم وغیرہ جیسی بنیادی چیزوں کو معلوم کر لیا اور پھر جیسے جیسے ان فلکی اجرام کے گہرے مشاہدے کیے گئے، ویسے ویسے انسان ان سے متعلقہ ایسی بہت سی چیزوں کا ادراک کرتا گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تخلیقی مقاصد میں شامل کر رکھا تھا اور بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و اذن ہی سے ممکن ہوا۔

ان معلومات کو علم فلکیات (Astronomy)، علم ہیئت، علم النجوم، علم صناعة التنجم وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے ان اجرام فلکی کے ساتھ بہت سی ایسی چیزوں کو مربوط کرنا شروع کر دیا جن کا ان اجرام سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہ تھا مثلاً ان اجرام فلکی کی حرکت و رفتار کے ساتھ لوگوں کی قسمت کے فیصلے وابستہ کیے جانے لگے۔ انسانی زندگی میں عروج و زوال، صحت و بیماری، فقر و غنیٰ، غمی و خوشی، کامیابی و ناکامی، فتح و شکست، وغیرہ جیسی بہت سی چیزوں میں بھی ان اجرام کو قطعی مؤثر سمجھا جانے لگا۔ ان کی حرکت و گردش کے ساتھ غیب کے دعوے اور مستقبل کی خبریں دی جانے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ توہم پرست انسان نے اپنی زندگی کے ہر معاملے کو دینی و مذہبی تعلیمات کی بجائے انہی اجرام سے

وابستہ کرلیا اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ انہیں خدائی کا درجہ دیا جانے لگا اور ان کی پرستش کی جانے لگی......معاذ اللہ!!

قرآن مجید میں ایک مقام پر اجرام فلکی کی پرستش سے منع کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنْ ءَايَـٰتِهِ ٱلَّيْلُ وَٱلنَّهَارُ وَٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوا۟ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَٱسْجُدُوا۟ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾ [سورة حمٓ السجدة:٣٧]

"دن اور رات، اور سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تم سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ اس اللہ کے لیے کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اگر تم واقعی اس اللہ کی عبادت کرنا چاہتے ہوتو۔"

کواکب پرستی کی ایک ادنیٰ سے مثال یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ ہفتہ کے دنوں کے نام انہی اجرام فلکی سے منسوب کرکے رکھے گئے جیسے انگریزی زبان میں اتوار کو سنڈے (Sunday) کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ ہے 'سورج کا دن' یعنی اس دن کو سورج دیوتا کا دن قرار دیا گیا۔ سوموار کو منڈے (Monday) کہا جاتا ہے یعنی چاند کا دن۔ گویا سورج کی طرح چاند کو بھی دیوتا تسلیم کیا گیا ہے اور اس دن کو چاند کی طرف منسوب کیا گیا۔ منگل کو ٹیوز ڈے (Tyuesday) سے موسوم کیا گیا ہے یعنی ٹیو، دیوتا کا دن اور کہا جاتا ہے کہ یہ ٹیو دراصل مریخ سیارے کے دیوتا کا نام ہے جس کی طرف اس دن کی نسبت کی گئی ہے۔ اسی طرح بدھ کو ویننس ڈے (Wednesday) سے موسوم کیا گیا ہے اور Weden دراصل عطارد سیارے کے دیوتا کا نام ہے جس کی طرف یہ دن منسوب ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ Weden دیوتا کے ایک بیٹے کا نام (Thor) ہے جو رعد (گرج کڑک) کا دیوتا تھا، اسے سیارہ مشتری کا دیوتا قرار دے کر اس کے نام سے جمعرات کو Thursday سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اور weden دیوتا کی بیوی کا نام فرگ (Frigg) یا (Friga) تھا جو زہرہ سیارے کی دیوی تھی اور اسی مناسبت سے جمعہ کو (Friday) یعنی 'فرگ' دیوی کا دن کہا جانے لگا۔ ہفتہ کو سیچر سیٹر ڈے (Saturday) کہا جاتا ہے اور (Satur) دراصل زحل سیارے کا نام ہے اور یہی اس کا دیوتا ہے۔ چنانچہ اسی سیارے کی طرف ہفتہ کا دن منسوب کر دیا گیا۔

اسی طرح ہندوؤں کے ہاں بھی ہفتہ کے دنوں کو مختلف سیاروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے مثلاً اہل ہند

زہرہ سیارے کو 'شکر' کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے جمعہ کو 'شکروار' سے موسوم کیا جاتا ہے اور زحل کو سینچر نام سے پکارتے ہیں اور اسی نسبت سے ہفتہ کو سینچر وار سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی مہینوں کے نام بھی مختلف سیاروں کی طرف منسوب کر کے رکھے گئے ہیں مثلاً پہلا انگریزی مہینہ جنوری (January) کہلاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ (جنوری) اہل مغرب کے معتقدات کے مطابق 'جینس' نامی رومن دیوتا کی چونکہ یاد تازہ کرتا ہے لہٰذا اسی دیوتا کر طرف اس مہینے کو منسوب کر دیا گیا۔

مذکورہ بالا تقویموں میں ہفتہ وار دنوں کے نام چونکہ دیوی دیوتاؤں اور سیاروں، ستاروں کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے شرک کا پہلو نمایاں کرتے تھے، اس لیے اسلام نے شرک کی بیخ کنی کرتے ہوئے ان دنوں کی نسبت کسی بھی مخلوق کی طرف کرنے کی بجائے محض عدد پر ان کی بنیاد رکھی تا کہ ان میں شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔ اسلامی تقویم کے مطابق ہفتہ وار دنوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ یوم الجمعہ (جمعہ)

۲۔ یوم السبت (ہفتہ)

۳۔ یوم الاحد (اتوار)

۴۔ یوم الاثنین (سوموار)

۵۔ یوم الثلثاء (منگل)

۶۔ یوم الاربعاء (بدھ)

۷۔ یوم الخمیس (جمعرات)

اجرام فلکی کے تین بنیادی مقصد

قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو بنیادی طور پر تین مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے:

۱)......راستوں اور سمتوں کی معلومات اور وقت کے تعین کے لیے

۲)......آسمان کی زیب وزینت کے لیے

۳)......شیطانوں کو مار بھگانے کے لیے۔

اب آئندہ سطور میں ان مقاصدِ ثلاثہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

ا)......راستوں اور سمتوں کی معلومات اور وقت کے تعین کے لیے

قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں:

(۱) : ﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴾ [سورة الانعام :۹۷]

''اور اسی ذات باری تعالیٰ نے تمہارے لیے ستاروں کو پیدا فرمایا تاکہ تم ان کے ذریعے سے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں راستہ معلوم کرو بلاشبہ ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کردیے ہیں؛ ان لوگوں کے لیے جو فہم وشعور رکھتے ہیں''۔

(۲) : ﴿ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ وَعَلٰمٰتٍ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ اَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾ [سورة النحل ۱۵ تا ۱۷]

''اور اس اللہ نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ (وہ زمین) تمہیں ہلا نہ دے اور نہریں اور راہیں بنا دیں تاکہ تم منزلِ مقصود کو پہنچو اور بھی بہت سی نشانیاں مقرر فرمائیں اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں، تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس جیسا ہے جو پیدا نہیں کرسکتا؟ کیا تم بالکل نہیں سوچتے''۔

(۳): ﴿ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُورًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴾ [سورة يونس:٦]

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ پیدا نہیں کیں۔ وہ یہ دلائل ان کو صاف صاف بتا رہا ہے جو علم ودانش رکھتے ہیں۔''

(٤) : ﴿ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴾ [سورة الرحمن:٥]

''سورج اور چاند (مقررہ) حساب سے ہیں''۔

یاد رہے کہ ستاروں اور دیگر اجرام فلکی کے تخلیقی مقاصد میں سے یہی ایک مقصد انسانوں کے لیے مختلف چیزوں کی معلومات کے لیے مفید اور مشروع (جائز) ہے اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس کا تعلق بھی علم ہیئت کی ان مختلف شاخوں سے ہے جن کے ذریعے ماہ وسال کا تعین، اوقات کا تقرر، کیلنڈروں کی تیاری اور سمتوں کے تعین وغیرہ میں مدد اور فائدہ حاصل کیا جاتا ہے جبکہ لوگوں کی تقدیر، کامیابی وناکامی، فتح و

تنست، وغیرہ جیسی غیبی اور مستقبل کی مخفی باتوں میں ان ستاروں اور سیاروں کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ ان معاملات میں انہیں مؤثر سمجھنا شرک ہے جیسا کہ آگے احادیث میں آرہا ہے۔

۲)......آسمان کی زیب وزینت کے لئے

اجرام فلکی کا دوسرا مقصد آسمان کی زیب وزینت ہے، جیسا کہ درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے:

(۱) : ﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِزِيۡنَةِ ۨ الۡكَوَاكِبِ﴾ [سورة الصافات:٦]

''ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے آراستہ کیا''۔

(۲) : ﴿ وَلَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ﴾ [سورة الملك:٥]

''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت والا بنا دیا''۔

(۳) : ﴿ وَلَقَدۡ جَعَلۡنَا فِى السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴾[سورة الحجر:١٦]

''یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لئے اسے سجا دیا''۔

(٤) : ﴿ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَحِفۡظًا﴾ [سورة فصلت:١٢]

''اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور نگہبانی کی''۔

۳)......شیطانوں کو مار بھگانے کے لئے

قرآن مجید میں ستاروں کی تخلیق کا تیسرا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہیں ان شیطانوں کے خلاف بطورِ ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آسمانی مجلس سے کوئی بات چرانے کے لیے عالم بالا کا رخ کرتے ہیں، قرآن مجید میں یہ بات مختلف مواقع پر اس طرح بیان ہوئی ہے:

(۱) : ﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِزِيۡنَةِ ۨ الۡكَوَاكِبِ وَحِفۡظًا مِّنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ مَّارِدٍ لَا يَسَّمَّعُوۡنَ اِلَى الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰى وَ يُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوۡرًا وَّلَهُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾ [سورة الصافات ٦ تا ١٠]

''ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا اور حفاظت کی سرکش شیطان سے۔ عالم بالا کے فرشتوں (کی باتوں) کو سننے کے لئے وہ کان بھی نہیں لگا سکتے۔ بلکہ ہر طرف سے وہ مارے جاتے ہیں بھگانے کے لیے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ مگر جو کوئی ایک آدھی بات اچک کر لے بھاگے تو (فوراً) اس کے پیچھے دہکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے''۔

(۲) : ﴿ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [سورة الحجر: ۱۷تا۱۸]

''یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لئے اسے سجادیا گیا اور اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھا گیا ہے جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرے اس کے پیچھے دہکتا ہوا (کھلا شعلہ، ٹوٹنے والا ستارہ) لگتا ہے''۔

(۳) : قرآن مجید میں خود جنوں کا اعتراف موجود ہے کہ ستارے ہم پر شعلہ بن کر برستے ہیں:

﴿ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ [سورة الجن: ۸تا۱۰]

''ہم نے آسمان کو ٹٹول کر دیکھا تو اسے سخت چوکیداروں سے بھرا ہوا پایا، اس سے پہلے ہم باتیں سننے کے لیے آسمان میں جگہ جگہ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اب جو بھی کان لگاتا ہے وہ ایک شعلے کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب کا ارادہ ان کے ساتھ بھلائی کا ہے''۔

ستاروں کو انسانی قسمت کے ساتھ مربوط سمجھنا شرکیہ عقیدہ ہے

گذشتہ دلائل سے معلوم ہوا کہ ستاروں کی تخلیق کے تین ہی مقاصد ہیں اور ان مقاصد سہ گانہ کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کی تبدیلیوں یا مستقبل کی باتوں (پیشگوئیوں) سے ان کا تعلق ہے۔ انسانی زندگی میں اگر ان کا کوئی تعلق ہوسکتا ہے تو وہ یہی کچھ ہے کہ ان سے راستوں اور سمتوں کی معلومات اور وقت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے اور علم ہیئت (Astronomy) فی الحقیقت اسی مقصد کے حصول کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ علم ہیئت میں جتنی بھی ترقی کی جائے، ہرگز مذموم نہیں۔ لیکن اگر ستاروں کو کائنات کا موثر عامل (Factor) سمجھا جانے لگے اور ان کی بنیاد پر مستقبل کی غیبی خبروں کے حصول کے دعوے کئے جانے لگیں تو پھر اسے علم ہیئت سے موسوم نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی قطعیت و حقیقت ہے۔

ستاروں کو انسانی قسمت کے ساتھ مربوط سمجھنا اسلامی نقطۂ نظر سے ایک شرکیہ عقیدہ ہے، اسی لیے اس طرح کی چیزوں میں وقت ضائع کرنے اور دلچسپی لینے کی ہر صورت کی اسلام سخت مذمت کرتا ہے۔ آئندہ

سطور میں اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کی چند صحیح احادیث پیش کی جاتی ہیں:

۱)...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنْ عِلْمِ النُّجُومِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ زَادَ مَا زَادَ))(۱)

''جس شخص نے 'نجوم' کے بارے میں کچھ بھی علم حاصل کیا، اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا، جتنا زیادہ علم نجوم سیکھے گا، گویا اتنا ہی زیادہ وہ جادو سیکھنے کے مترادف ہوگا۔''

۲)...... حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

((صَلّٰى لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى اِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلَةِ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ، قَالَ: اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ فَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ وَاَمَّا مَنْ قَالَ (مُطِرْنَا) بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ))(۲)

''نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ میں ہم کو ایک صبح نماز پڑھائی۔ اس رات بارش ہوئی تھی۔ نماز کے بعد آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: معلوم ہے تمہارے رب نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ خوب جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پروردگار نے فرمایا ہے: آج میرے دو طرح کے بندوں نے صبح کی۔ ایک مومن ہیں اور ایک کافر۔ جس نے کہا کہ اللہ کے فضل و رحم سے بارش ہوئی وہ تو مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا اور جس نے کہا فلاں تارے کے فلاں جگہ آنے سے بارش ہوئی تو اس نے میرا کفر کیا اور وہ تاروں پر ایمان لایا''۔

۳)...... حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَرْبَعٌ فِيْ اُمَّتِيْ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُوْنَهُنَّ ؛ اَلْفَخْرُ فِي الْحِسَابِ وَالطَّعْنُ فِي الْاَنْسَابِ وَالْاَسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُوْمِ وَالنِّيَاحَةُ))

۱۔ ابو داؤد، کتاب الطب، باب فی النجوم، ح ۳۹۰۵۔ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب تعلم النجوم، ح ۳۷۶۶۔

۲۔ بخاری، کتاب الاذان، باب یستقبل الامام الناس اذا سلم، ح ۸۴۶۔ ۱۰۳۸۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء ح ۷۱۔ احمد، ج ۴ ص ۱۱۷۔ مؤطا، ج ۱ ص ۱۹۲۔

''دورِ جاہلیت کی چار چیزیں ایسی ہیں جنہیں میری امت نہیں چھوڑے گی: اپنے حسب نسب پر فخر کرنا۔ (دوسروں کے) حسب نسب پر طعن کرنا۔ تاروں سے بارش طلب کرنا۔ نوحہ کرنا''۔ [1]

۴)..... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيْ خَصْلَتَيْنِ تَكْذِيبًا بِالْقَدَرِ وَإِيمَانًا بِالنُّجُومِ))

''مجھے اپنی امت کے بارے میں دو چیزوں کا اندیشہ ہے: ایک تقدیر کی تکذیب کا اور دوسرا نجوم پر ایمان لانے کا''۔ [2]

۵)..... حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں تین چیزوں کا ذکر ہے یعنی اس میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيْ ثَلَاثًا: حَيْفُ الْأَئِمَّةِ وَإِيمَانًا بِالنُّجُومِ وَتَكْذِيبًا بِالْقَدَرِ))

''مجھے اپنی امت کے بارے میں ان تین چیزوں کا خطرہ ہے: (۱) امراء و حکام کا ظلم، (۲) تاروں پر ایمان، (۳) تقدیر کی تکذیب''۔ [3]

۶)..... حضرت قتادہ تابعیؒ فرماتے ہیں کہ

((خُلِقَ هٰذِهِ النُّجُومِ لِثَلَاثٍ جَعَلَهَا زِينَةً لِّلسَّمَآءِ وَرُجُومًا لِّلشَّيَاطِيْنِ وَعَلَامَاتٍ يُهْتَدٰى بِهَا فَمَنْ تَأَوَّلَ فِيهَا بِغَيْرِ ذٰلِكَ أَخْطَأَ وَأَضَاعَ نَصِيبَهُ وَتَكَلَّفَ مَا لَا عِلْمَ لَهُ بِهِ))

''ان ستاروں کو تین مقاصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے: ایک تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی خوبصورتی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ دوسرا شیاطین کو مار بھگانے کے لیے اور تیسرا انہیں راستہ معلوم کرنے کے لیے ذریعہ بنایا ہے۔ لہٰذا جس شخص نے ان (تین مقاصد) کے سوا دیگر باتیں کہیں تو اس نے غلطی کی اور اپنا حصہ تباہ کر لیا اور جو بات غیب کی معلوم نہیں ہو سکتی تھی، اسے معلوم کرنے میں تکلف کیا''۔ [4]

۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء، ح ۷۲۔

۲۔ ابویعلیٰ، ح ۳۹۱۱۔ مجمع الزوائد، ج ۳ ص ۱۲۔ امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ امام سیوطیؒ نے بھی اس روایت کو حسن کہا ہے۔ بحوالہ: فتح المجید شرح کتاب التوحید، ص ۲۵۷۔

۳۔ رواہ ابن عساکر و حسنہ السیوطی، بحوالہ: فتح المجید، ص ۲۵۷۔

۴۔ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب فی النجوم۔

۴۔ فالنامے اور انسانی قسمت

'فال' کیا ہے؟ اس کے بارے میں حاجی خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ

" وهو علم يعرف به بعض الحوادث الآتية من جنس الكلام المسموع من الغير او بفتح المصحف او كتب المشائخ كديوان الحافظ والمثنوى ونحوهما"(۱)

''یعنی فال ایسا علم ہے جس کے ذریعے مستقبل کے بعض واقعات کو معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کسی شخص سے اچانک کوئی بات سننے یا قرآن مجید کھولنے یا قرآن کے علاوہ دیگر کتابیں مثلاً دیوانِ حافظ اور مثنوی وغیرہ کھولنے کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے''۔

دورِ جاہلیت میں لوگ اپنے سفر، کاروبار، شادی اور دیگر معاملات میں عموماً تیروں کے ذریعے فال نکالتے اور ان تیروں پر ہاں، کرلو وغیرہ کے الفاظ ہوتے یا اس کے برعکس نہیں، نہ کرو وغیرہ جیسے الفاظ ہوتے اور بعض تیر بالکل خالی ہوتے۔ اگر ایسا تیر نکلتا جس پر مطلوبہ کام کرنے کا مشورہ ہوتا تو وہ لوگ اس کے مطابق مطلوبہ کام کرتے، اگر نہ کرنے کا تیر نکلتا تو اس کام کو چھوڑ دیا جاتا اور اگر سادہ تیر نکلتا تو دوبارہ قسمت آزمائی کے لئے فال نکالی جاتی۔

فال کی دو قسمیں

فقہاء و علماء نے فال کی دو قسمیں بیان کی ہیں جیسا کہ امام قرافی لکھتے ہیں کہ

''فال کی دو قسمیں ہیں، ایک مباح و جائز ہے (یعنی جس میں اچھے کلمات کی بنیاد پر حسن ظن قائم کیا جاتا ہے) اور وہ حدیث کہ نبی کریم ﷺ اچھی فال کو پسند کیا کرتے تھے، اسے اسی مباح قسم پر محمول کیا جائے گا اور دوسری قسم حرام ہے جیسا کہ امام طرطوشی فرماتے ہیں کہ قرآن سے یا علم رمل سے یا قرعہ وغیرہ سے فال لینا یہ سب حرام ہے کیونکہ یہ استقسام میں شامل ہے اور استقسام یہ ہے کہ اہل عرب کے پاس فالنامے کے تیر ہوتے۔ ایک پر افعل (کرلو) اور دوسرے پر لاتفعل (نہ کرو) اور تیسرے پر غفل (یعنی کچھ لکھا نہ) ہوتا۔ اگر پہلا تیر نکلتا تو وہ مطلوبہ کام کرتے، دوسری قسم کا نکلتا تو وہ مطلوبہ کام نہ کرتے

۱۔ کشف الظنون، ج ۲ ص ۱۲۱۶۔ مفتاح السعادۃ، ج ۲ ص ۳۳۷۔

اور تیسری قسم کا تیر نکلتا تو دوبارہ پھر تیر سے فال نکالتے۔ یہ غیب معلوم کرنے کی ایک قسم ہے اور اسے استقسام اس لئے کہا گیا ہے کہ اس سے اچھی قسم (یعنی ہاں والے تیر) کی تلاش کی جاتی اور بری قسم (یعنی نہ کرو والے تیر) کی وجہ سے مطلوبہ کام نہ کیا جاتا۔ یہ وہی استقسام بالازلام ہے جس کی حرمت قرآن مجید میں موجود ہے لہٰذا ایسی فال نکالنے کا عمل حرام ہے''۔[1]

جائز فال کون سی ہے؟

فال کی ایک قسم جائز و مباح ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی اچھے کلمہ کو سن کر اچھا گمان کرنا مثلاً بیمار شخص کسی سے 'تندرست' یا 'صحت' یا 'سالم' اور 'صحیح' وغیرہ کا لفظ سن کر یہ گمان کرے کہ وہ عنقریب صحت مند ہو جائے گا یا کوئی لشکر لفظ غنیمت سن کر یہ فال لے کہ انہیں اس معرکہ میں کامیابی حاصل ہوگی یا کوئی طالب علم امتحان سے پہلے لفظ نجات (نجاح وغیرہ) سن کر یہ حسن ظن قائم کرے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جس طرح خوشبو سے انسانی ذہن فرحت و تازگی محسوس کرتا ہے، اسی طرح اچھے کلمات سے بھی انسان طبعی طور پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے اچھے کلمات سے فال لینا یعنی اچھا گمان قائم کرنا بالکل مستحب ہے بلکہ اس لحاظ سے اسے سنت بھی کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی اچھے کلمات سے فال لینا (یعنی حسن ظن قائم کرنا) پسند کیا ہے اور آپؐ نے فال کی تعریف ہی یہ کی کہ اس سے مراد اچھا کلمہ (الكلمة الطيبة یا الكلمة الصالحة) ہے اور درج ذیل احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

(۱)...... ((عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِىُّ ﷺ : لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَالُ، قَالُوا وَمَا الْفَالُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ))[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بدشگونی کی کوئی اصل نہیں اور اس سلسلہ میں بہترین چیز 'فال' ہے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! فال کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: فال وہ عمدہ بات (نیک اور اچھی بات) ہے جو تم میں سے کوئی (اچانک) سنتا ہے''۔

(۲)...... ((عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِىِّ ﷺ قَالَ: لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ وَيُعْجِبُنِىَ الْفَالُ الصَّالِحُ اَلْكَلِمَةُ الْحَسَنَةُ))[3]

۱۔ الفروق، للقرافی، ج٤ ص ٢٤٠، ٢٤١۔
۲۔ صحیح البخاری، کتاب الطب، باب الفال، ح ٥٧٥٥۔
۳۔ صحیح البخاری، ایضاً، ح ٥٧٥٦۔ جامع الترمذی، ح ١٦١٥۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بیماری (فی ذاتہ) متعدی نہیں ہوتی (یعنی اللہ کے حکم کے بغیر اثر نہیں کرتی) اور نہ بدشگونی کی کوئی اصل ہے اور مجھے اچھی فال پسند ہے یعنی کوئی کلمہ خیر''۔

(۳)...... ((عَنْ بُرَيْدَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَتَطَيَّرُ مِنْ شَيْءٍ وَكَانَ اِذَا بَعَثَ عَامِلاً سَأَلَ عَنِ اسْمِهِ فَاِذَا اَعْجَبَهُ اسْمُهُ فَرِحَ بِهِ وَرُؤِيَ بُشْر ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهِ وَاِنْ كَرِهَ اسْمَهُ رُؤِيَ كَرَاهِيَتُهُ ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهِ وَاِذَا دَخَلَ قَرْيَةً سَأَلَ عَنِ اسْمِهَا فَاِذَا (فَاِن) اَعْجَبَهُ اسْمُهُ فَرِحَ بِهَا وَرُؤِيَ بُشْر ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهِ وَاِنْ كَرِهَ اسْمَهَا رُؤِيَ كَرَاهِيَةُ ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهِ))[1]

''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کسی چیز سے بُرا شگون نہیں لیا کرتے تھے اور جب آپ ﷺ کسی شخص کو ذمہ دار بنا کر کہیں روانہ فرمانا چاہتے تو اس کا نام دریافت کرتے۔ اگر اس کا نام آپ کو پسند آتا تو آپ خوش ہوتے اور خوشی سے آپ کا چہرہ مسکرا اٹھتا لیکن اگر آپ اس نام کو ناپسند کرتے تو ناپسندیدگی کے آثار بھی آپ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہو جاتے۔ اسی طرح جب آپ ﷺ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس بستی کا نام دریافت فرماتے، اگر وہ نام آپ کو پسند آتا تو آپ کے چہرہ مبارک پر خوشی کے آثار دکھائی دیتے اور اگر وہ نام پسند نہ آتا تو آپ کے چہرہ مبارک پر کراہت کے آثار نمایاں ہوتے''۔

(٤)......((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَفَاؤَلُ وَلَا يَتَطَيَّرُ وَيُعْجِبُهُ الْاِسْمُ الْحَسَنُ))

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ فال لیا کرتے تھے اور برا شگون نہیں لیتے تھے۔ آپ ﷺ کو اچھا نام پسند تھا''۔[2]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ اچھے کلمات سن کر اچھا گمان کرنا ہی 'فال' ہے کیونکہ فال کی یہی تعریف حضور ﷺ سے منقول ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ اچھے ناموں کو پسند فرماتے اور اچھے نام رکھنے کی ترغیب

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الطیرۃ۔ نیز دیکھیے: مسند احمد، ج۵ ص۳۴۸۔ صحیح ابن حبان، ج۱۴۳۰۔ شیخ البانیؒ نے مختلف طرق کی بناء پر اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: السلسلۃ الصحیحۃ، ج۷۶۲۔ نیز حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: فتح الباری، ج۱۰ ص۲۱۵۔ البتہ اس کی اسناد میں قتادہ (مدلس راوی) کے سماع کی صراحت مذکور نہیں۔ ممکن ہے کہ عمومی دلائل کی مناسبت سے اہل علم نے اسے قابل استشہاد [illegible]۔

۲۔ احمد، ج۱ ص۲۵۷، ۳۰۴۔ طیالسی، ج۲۶۹۰۔ شرح السنۃ، ج۴ ص۳۲۵۔ السلسلۃ الصحیحۃ، ج[illegible]۔

دلاتے اور اگر کسی کا نام برا ہوتا تو آپ اسے تبدیل فرما دیتے جبکہ مشرک لوگ فال سے فالنامہ مراد لیتے اور اچھے اور برے دونوں طرح کے معاملات کی پیشگی معلومات کے لئے تیروں کی قرعہ اندازی پر اعتماد کرتے۔ اگر ان کی فال اور قسمت آزمائی میں ناپسندیدہ چیز برآمد ہوتی تو وہ بدظنی کا شکار ہو جاتے اور اس بدظنی کے پیچھے کوئی معقول وجہ بھی نہ ہوتی۔ اس لئے اسلام نے اس چیز کو ناپسند کرتے ہوئے اس سے منع فرما دیا ہے۔

فال کی ناجائز قسم

فال کی دوسری قسم وہ ہے جس میں فالناموں وغیرہ کے ذریعے قسمت آزمائی کی جاتی ہے۔ اس فال کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی کام سے پہلے محض توہم پرستی یا اٹکل پچو سے اس کے اچھے یا برے نتائج معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ قسم نہ صرف ناجائز اور ممنوع ہے بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر و شرک کا مرتکب بھی بنا دیتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ مختلف ظاہری اسباب وعوامل اور سابقہ تجربات کے ذریعے کسی کام کے پیشگی اثرات ونتائج معلوم کرنا فالنامہ میں داخل نہیں بلکہ یہ ظاہری اسباب پر موقوف ہے۔ اس لئے تجربات سے فائدہ اٹھانا قطعی طور پر درست اور بصیرت ودانائی کی علامت ہے مثلاً کوئی شخص خاص قسم کا کاروبار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس سلسلہ میں ایسے لوگوں سے رابطہ کرتا ہے جو پہلے سے یہ کاروبار کر رہے ہیں یا کسی وقت کرتے رہے ہیں تاکہ اس کاروبار کے تمام اچھے، برے پہلو واضح ہو جائیں، تو یہ اقدام بلاشبہ جائز ہے لیکن 'فٹ پاتھ' پر بیٹھے سارے جہان کی خاک چھاننے والے، دوکوڑی کے محتاج احمق عامل کے پاس بیٹھ کر کسی کاغذ پر آنکھیں بند کر کے انگلی پھیرنا اور ہاں یا ناں میں اپنے مقصد کا حل تلاش کرنا اور غیب جاننے کی کوشش کرنا حماقت و بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے......؟!

اس عمل (فالنامہ) کا تعلق عقیدے سے ہے کہ انسانی اپنی اچھی یا بری نامعلوم تقدیر کی بجائے ان نجومیوں، کاہنوں اور عاملوں کی فالوں پر یقین کر لیتا ہے اور ناپسندیدہ فال نکلنے پر اپنی قسمت کا ماتم کرتا ہے اور ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ فالنامے کی 'ہاں' یا 'نہ' وغیرہ کی کوئی اٹل حقیقت نہیں بلکہ ہر شخص کی تقدیر ہی اٹل ہے اور دعا کے علاوہ کوئی چیز اس تقدیر میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی خواہ کوئی فال جیسا خیالی عمل ہو یا کوئی واقعی زبردست قوت، اللہ کے نزدیک یہ سب ہیچ ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو تقدیر کو ایمانیات میں داخل کرنے کی وجہ ہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر مسلمان میں عقیدے کی پختگی پیدا ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾
''تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے یا زمین پر جو آفت آتی ہے، ہم اسے پیدا کرنے سے پہلے ہی تقدیر میں لکھ چکے ہیں''۔[سورۃ الحدید:۲۲]

دوسری بات یہ ہے کہ ناپسندیدہ فال نکلنے پر انسان ناامید ہوکر محنت اور تگ ودو چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا مسلمان کا کام نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَيْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [يوسف: ٨٧]
''اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ کی رحمت سے ناامید وہی لوگ ہوتے ہیں جو کافر ہیں''۔

دور حاضر میں فال نکالنے والوں کا پیشہ جاہل عوام میں خاصا مقبول ہے۔ شہروں میں جگہ جگہ مختلف نجومیوں، دست شناسوں، کاہنوں اور عاملوں کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں ہوتے ہیں جن پر ناممکن کو ممکن بنانے کے بلند بانگ دعوے درج ہوتے ہیں۔ مثلاً ''محبوب آپ کے قدموں میں'' ..... ''جو چاہو سو پوچھو'' ''دشمنوں سے تحفظ'' ..... ''ہر تمنا پوری ہوگی'' ..... ''کالے علم کی کاٹ پلٹ کے ماہر'' ..... وغیرہ۔

اسی طرح ان لوگوں کے پاس تربیت یافتہ طوطے بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعے مختلف لفافے اٹھوا کر کھولے جاتے ہیں اور جاہلوں کو ان کی قسمت کا حال بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان میں سے بعض نے چاک اور سلیٹ بھی رکھی ہوتی ہے جس پر مختلف خانوں میں حروف تہجی یا حروف ابجد لکھے ہوتے ہیں اور گاہک سے آنکھیں بند کروا کر اس کی انگلی ان پر گھما کر کسی ایک حرف پر اچانک رکوادی جاتی ہے اور پھر ان حروف کے اپنی طرف سے لکھے ہوئے خود ساختہ نتائج میں سے کوئی نتیجہ سنا کر چلتا کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اس موضوع کی بہت سی کتابیں بھی مارکیٹ میں عام متداول رہتی ہیں، ان پر ایسے ہی جھوٹے اور خود ساختہ فالنامے درج ہوتے ہیں کہ سائل ایک ہی مرتبہ ایسی کتاب خرید کر رکھ لے پھر ساری زندگی ہر کام سے پہلے اس میں موجود جعلی فالناموں سے مشورہ کرتا رہے حالانکہ ان کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ ہی ان سے غیبی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ قرآن سے فال لینے کا عمل کرتے ہیں، اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: ''انسان اور کالے پیلے علوم''۔

......☆......

باب ۷

قضاوقدر کے بارے علماءِ اہل سنت کا موقف

آئندہ سطور میں ہم مسئلہ تقدیر کے حوالے سے چند سنی اہل علم کی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ متقدمین میں سے ہم نے امام طحاوی حنفیؒ کا انتخاب کیا ہے اور متاخرین میں سے علامہ ابن تیمیہؒ کا۔ اسی طرح معاصر اہل علم میں سے عالم عرب سے ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی اور علمائے ہند میں سے مولانا مودودیؒ کی کچھ تحریریں شامل کتاب ہیں۔

۱۔ علامہ یوسف القرضاوی اور مسئلہ تقدیر

علامہ یوسف قرضاوی مسئلہ تقدیر کے حوالے سے اپنی کتاب 'الایمان بالقدر' میں لکھتے ہیں:

''تقدیر کے چار مراتب یا درجات ہیں:

۱۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے وقوع سے پہلے ہی اس کا علم ہوتا ہے۔ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ کسی چیز کے وقوع سے پہلے ہی اسے علم ہوتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہوگی، کب اور کہاں واقع ہوگی؟......

اللہ کے علم میں اگر ایک چیز تھی کہ یہ واقع ہوگی تو پھر لامحالہ وہ واقع ہو کر رہے گی اور اگر اس کے علم کے مطابق ایک چیز واقع نہیں ہونی تو پھر وہ واقع نہیں ہو سکتی۔ اور جس چیز کے بارے میں اسے علم ہے کہ یہ فلاں صفت اور فلاں حالت کے ساتھ واقع ہوگی تو پھر وہ لازماً اسی صفت اور اسی حالت کے ساتھ واقع ہوگی۔ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اور نہ ہی ساری مخلوق مل کر اس چیز میں تبدیلی کر سکتی ہے جو اللہ کے علم میں موجود ہے، اگر ایسا ہو جائے تو اس سے اللہ کا علم جہل سے بدل جائے، معاذ اللہ!

۲۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ رونما ہوتا ہے سب اللہ کی مشیتِ نافذہ اور ارادۂ کونیہ عامہ کے تحت ہوتا ہے۔ کسی عمل کرنے والے کا عمل اور کسی بات کرنے والے کی بات اس سے خارج نہیں ہے۔......

۳۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے، سب اللہ کی خلق اور اس کی قدرت کے اثر سے ہے اور اس خلق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔......

۴۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ نے شروع ہی سے اپنے پاس ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھ رکھا ہے۔ [الایمان بالقدر، للقرضاوی، ص ٥، ٦]

علامہ قرضاوی اس کے بعد مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''تقدیر الٰہی کے دائرہ کو ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں کائنات کا وہ وسیع و عریض نظام شامل ہے جس کے تحت افلاک و کواکب سفر کر رہے ہیں، ہوائیں اور بادل چل رہے ہیں، بارش برستی اور دن رات آتے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ نظام نباتات اور جمادات کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔.... عالم بالا اور عالم ارضی کی یہ تمام اشیا جو ہم دیکھ سکتے ہیں اور جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں یہ سب اللہ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق کام کر رہی ہیں۔ اللہ کے علم میں ان میں سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں اور نہ ان میں سے کوئی چیز اللہ کی مشیت اور قدرت سے باہر ہے۔ اللہ نے کائنات میں جو قانون اور نظام بنا دیا ہے یہ سب اسی کے مطابق چل رہی ہیں اور ظاہر ہے یہ نظام اللہ نے اپنی مشیت اور حکمت کے تحت بنایا ہے۔

اور تقدیر کے چاروں مراتب (جو اس سے پہلے بیان ہوئے ہیں یعنی) علم، کتابت، مشیت اور قدرت کا اطلاق اس پر ہوتا ہے اور مخلوق میں سے کسی بھی چھوٹے یا بڑے کو اس نظام کے چلانے میں نہ کوئی اختیار ہے اور نہ اس کے بدلنے میں کوئی طاقت ہے۔ اللہ کے رسولؐ کے بیٹے ابراہیمؓ کی وفات اتفاقاً اس روز ہوئی جب سورج گرہن تھا اور کچھ لوگ یہ سمجھے کہ شاید سورج کو گرہن ابراہیمؓ کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے تو نبی کریمؐ نے فوراً اس خیال کی نفی فرما دی اور ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ لَا تَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ))

''یہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے انہیں گرہن نہیں لگتا''۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو اگرچہ ہم انسانوں سے تعلق رکھتی ہے مگر وہ بھی ہمارے اختیار و ارادے سے کلی طور پر باہر ہے مثلاً اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے مگر کیوں پیدا کیا؟ پھر انسان ہی کیوں بنایا؟ کسی کو مرد اور کسی کو عورت کیوں بنایا؟ کسی کو عربی النسل اور کسی کو عجمی النسل کیوں بنایا؟ کسی کو فلاں جگہ کیوں پیدا کیا، فلاں جگہ کیوں نہ پیدا کیا؟ فلاں کو فلاں وقت میں کیوں پیدا کیا، فلاں میں کیوں نہ کیا؟ کسی کو سفید اور کسی کو سیاہ کیوں بنایا؟ کسی کو بے وقوف اور کسی کو دانش ور کیوں بنایا؟ کسی کو بہت طویل اور کسی کو بہت پست قد کیوں بنایا؟ کسی کو سو سال زندگی دے دی اور کسی کو پیدا ہوتے ہی موت دی، آخر کیوں؟؟

یہ سب وہ سوال ہیں جن کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اللہ کی مشیت اور قدرت کا ارادہ ہی یہ تھا......

پس یہ وہ معاملات ہیں جن میں ہم مجبور محض ہیں اور اس سلسلہ میں ہم پر تقدیر کے چاروں مراتب جاری ہیں۔ ہم ان میں سے کسی چیز کے نہ مسئول ہیں اور نہ ہی ہم سے ان میں سے کسی چیز کے بارے میں دنیا یا آخرت میں کوئی سوال ہوگا۔ نہ ہم سے ہماری ذہانت کے بارے میں پوچھا جائے گا اور نہ بے وقوفی کے

بارے میں۔ نہ ہمارے سفید رنگ کے بارے میں سوال ہوگا اور نہ سیاہ رنگ کے بارے۔ نہ ہمارے لمبے قد کے بارے محاسبہ ہوگا اور نہ چھوٹے قد کے بارے۔ نہ ہماری عمروں کے بارے اور نہ موت کے بارے۔ نہ آباؤاجداد کے بارے اور نہ کنبے اور قبیلے کے بارے۔

ہمارے لیے اس سلسلہ میں یہی ہدایت ہے کہ ہم اس بات پر راضی رہیں جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے اور اس پر یقین رکھیں کہ ضرور اس میں اللہ کی کوئی حکمت ہوگی جو کبھی ہمیں معلوم ہو بھی سکتی ہے اور کبھی معلوم نہیں بھی ہوتی۔

۳۔ تیسری قسم وہ ہے جو ہمارے اختیاری اعمال کے بارے میں ہے۔ اختیاری اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے کرتے وقت انسان کو یہ شعور ہوتا ہے کہ میں اپنے قصد وارادہ کے ساتھ انہیں کر رہا ہوں اور مجھے اس کے کرنے کی پوری طاقت ہے مثلاً کھانا پینا، جائز لباس پہننا، اسی طرح نیکی کے مختلف کام کرنا مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، صدقہ کرنا، حج کرنا، جہاد کرنا، اللہ کا ذکر کرنا۔ اسی طرح اللہ کی نافرمانی کے کام کرنا مثلاً زنا کرنا، چوری کرنا، شراب پینا، سود کھانا وغیرہ۔

کیا ان کاموں پر بھی تقدیر کے وہ چاروں مراتب صادق آتے ہیں جو اس سے پیچھے ذکر کردہ دو قسموں پر صادق آتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کیا یہ اعمال جنہیں ہم شعور کے ساتھ کرتے ہیں، کیا ہم ان پر اختیار اور قدرت رکھتے ہیں اور کیا یہ اللہ کے علم میں اسی طرح موجود اور شروع ہی سے اس کے ہاں اسی طرح ہونا لکھے ہوئے ہیں اور کیا یہ اللہ کی مشیت نافذہ اور قدرت نافذہ کے تحت انجام پاتے ہیں؟؟
جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا یہ سب اللہ کے علم اور اس کی لکھی لوحِ محفوظ میں پہلے سے موجود تھا (کہ ایسا ہوگا) تو اسے مسلمانوں کے گروہوں میں سے معتزلہ اور اہل سنت وغیرہ بھی تسلیم کرتے ہیں سوائے قدریہ فرقہ میں سے چند ایک وہ پرانے لوگ جن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، جابرؓ وغیرہ کا سامنا ہوا اور ان صحابہ نے ان پر تکفیر اور دین اسلام سے مرتد ہو جانے کا حکم لگایا کیونکہ یہ قرآن کے صریح نصوص اور دین کی مسلمات کا انکار کرتے تھے۔ یہ حضرت معاویہؓ کے دور کے بعد اس وقت کی بات ہے جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور بنی امیہ کے درمیان لڑائی جاری تھی۔ سب سے پہلے یہ رائے معبد جہنی نے پیش کی۔ یہ لوگ زیادہ دیر تک باقی نہ رہے اور وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔

اصل اختلاف اس بات میں پیدا ہوا کہ انسان جو کچھ اعمال انجام دیتا ہے، یہ سب وہ اللہ کے ارادے اور قدرت سے انجام دیتا ہے یا خود اپنے ارادے اور قدرت کے ساتھ؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان اچھے برے جو عمل انجام دیتے ہیں، یہ سب اللہ ہی کا ارادہ ہوتا ہے اور اللہ ہی ان سب کا خالق و فاعل ہوتا ہے یا بندہ ان سب کا فاعل و خالق ہوتا اور اسی کے ارادے سے یہ سب ہوتا ہے؟؟

یہی وہ مقام ہے جہاں قدم پھسلے، عقلیں گمراہ ہوئیں اور اہل کلام میں اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ کچھ اس سلسلہ میں انتہاء کو پہنچے اور کچھ اعتدال پر قائم رہے''۔[ایضاً ص ۱۱ تا ۱۳]

اس کے بعد علامہ قرضاوی مختلف فرقوں مثلاً جبریہ، قدریہ وغیرہ کا اس سلسلہ میں موقف واضح کرتے اور ان پر نقد کرنے کے بعد اہل سنت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اہل سنت ہی کا موقف اس بارے معتدل اور کتاب وسنت کے عین مطابق ہے اور اہل سنت کا موقف ان نکات پر مبنی ہے:

''۱۔ ہماری عقل ومشاہدہ بدیہی (واضح) طور پر ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے کچھ افعال اختیاری ہیں جو ہمارے ارادے اور قدرت پر منحصر ہیں۔ ہم جب دائیں جانب حرکت کا ارادہ کرتے ہیں تو ہماری حرکت بائیں نہیں ہوتی۔ جب ہم روٹی کھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اپنے منہ میں مٹی نہیں پھانکتے۔ جب ہم مسجد جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو کسی شراب خانہ میں نہیں پہنچ جاتے۔ ہم قطعی طور پر اس بات میں فرق سمجھتے ہیں کہ سیڑھی کے اوپر چڑھنا کسے کہتے ہیں اور سیڑھی سے نیچے گرنا کیا ہوتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ سیڑھی پر چڑھنے والا اپنے اس عمل میں اختیار رکھتا ہے جب کہ گرنے والا بے اختیار ہو کر گرتا ہے۔

۲۔ ہم اپنی شریعت یعنی قرآن وسنت کی روشنی میں قطعی طور پر جانتے ہیں کہ اللہ ہی نے ہمارے اندر ارادہ اور قدرت کو پیدا کیا ہے اور انہی دونوں چیزوں کے ساتھ ہم اپنے کام انجام دیتے ہیں۔ یہی ارادہ اور قدرت ہماری ذمہ داری کی بنیاد ہے اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت میں ہم سے محاسبہ ہوگا۔ اسی کی بنیاد پر تعریف یا مذمت کی جاتی ہے، اسی کی بنیاد پر ثواب اور سزا کا دارومدار ہوگا۔ اور اسی کی روشنی میں جنت اور جہنم میں جگہ ملنے کا فیصلہ ہوگا۔ بے شمار نصوص (آیات واحادیث) اس بارے میں موجود ہیں۔

۳۔ یہ بات (جو اوپر ذکر ہوئی) تسلیم کر لینے سے اس عقیدہ کی نفی نہیں ہوتی جو ہم اللہ کے بارے میں رکھتے ہیں کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، سب اسی کی مشیت اور قدرت سے ہوتا ہے کیونکہ وہی انسان اور انسان کو دی گئی طاقتوں اور مادی ومعنوی صفات کا بھی خالق ہے۔ اور انہی طاقتوں میں سے ارادے اور قدرت کی وہ دو طاقتیں بھی ہیں جن کی بنیاد پر انسان اپنے تمام ارادی افعال انجام دیتا ہے۔ یہ دو طاقتیں دراصل اللہ کی طرف سے تمام مخلوق میں جاری اس کی سنت کے مطابق ایک سبب ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان افعال انجام دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے سبب اور مسبب دونوں کا خالق اللہ ہی ہے اور اگر اللہ ایک کام کو نہ چاہتا تو پھر وہ اس کام کے سبب کو بھی پیدا نہ کرتا۔

۴۔ اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کے افعال کا خالق ہے کیونکہ اس کی سنت یہ ہے کہ وہ اشیا کو ان کے اسباب کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور انہی اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو قدرت، ارداہ اور اختیار کی طاقت دی، جیسا کہ انسان اس ارادے اور قدرت کے ساتھ اپنے کاموں میں سے جو چاہتا

ہے کر لیتا ہے۔ یہی موقف معتدل ہے اور قرآن وسنت کے نصوص اسی کی تائید کرتے ہیں اور اسی کو اختیار کرنے میں ہم ان غلط فہمیوں سے بچ سکتے ہیں جن میں جبریہ وقدریہ ورطہ حیرت میں ہیں"۔ [ایضا،ص ۱۸، ۱۹]

۲۔ مولانا مودودیؒ اور مسئلہ تقدیر

مولانا مودودیؒ تقدیر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تقدیر سابق اور انسان کی آزادیٔ ارادہ کے درمیان کس نوعیت کا تعلق ہے اور ان دونوں کے حدود کیا ہیں، یہ مسئلہ درحقیقت ہماری گرفت سے باہر ہے اور اس کے متعلق کوئی یقینی بات کہنے کی پوزیشن میں ہم نہیں ہیں۔ البتہ اصولی طور پر تین باتیں ایسی ہیں جو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں:

ایک یہ کہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر قادر نہیں ہے بلکہ جو طاقت پوری کائنات کا نظام چلا رہی ہے، وہی انسان کی (بحیثیتِ نوع، بحیثیتِ گروہ اور بحیثیتِ فرد) تقدیر بناتی ہے۔ البتہ اس کا ایک حصہ (جس کی مقدار ہمیں معلوم نہیں) انسان کے دائرہ اختیار میں ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کا علم سابق انسان کے تمام آنے والے حالات پر حاوی ہے۔ خدائی کا عظیم الشان کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا اگر خدا اپنی کائنات میں ہونے والے واقعات سے بے خبر ہو اور کوئی واقعہ جب پیش آئے تب ہی اسے خبر ہو۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی قدرت نے انسان کو محدود پیمانے پر کچھ اختیارات دیے ہیں جن کے لیے آزادیٔ ارادہ ناگزیر ہے اور اللہ کا علم خود اس کی قدرت کے کسی فعل کو باطل نہیں کرتا"۔ [رسائل ومسائل، ج ٤، ص ٦٧، ٦٨]

مسئلہ جبر وقدر اور مولانا مودودیؒ

مولانا مودودیؒ نے مسئلہ جبر وقدر کے نام سے عقیدہ تقدیر کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی ہے، اس کے آخر میں آپ نے اسی موضوع پر اپنا ایک مقالہ بھی شامل کیا ہے، جو ایک لحاظ سے ان کی اسی کتاب (مسئلہ جبر وقدر) کا خلاصہ ہی ہے، ذیل میں اس مقالہ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"کیا ہماری تقدیر پہلے سے مقرر ہے؟ کیا ہماری کامیابی اور ناکامی، ہمارا گرنا اور ابھرنا، ہمارا بگڑنا اور سدھرنا، ہماری راحت اور تکلیف اور وہ سب کچھ جو ہمارے ساتھ اس دنیا میں پیش آتا ہے کسی اور طاقت یا طاقتوں کے فیصلہ کا نتیجہ ہے جس کے متعین کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم بالکل مجبور ہیں؟ کیا ہم اس دنیا میں محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں جنہیں کوئی اور نچا رہا ہے؟ کیا ہم کسی بنی بنائی سکیم کو عمل میں لانے کے لیے بس ایک آلہ کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں، گویا کہ ہم دنیا کے اسٹیج پر ان ایکٹروں کی طرح ہیں جن میں سے ہر

ایک کا کام پہلے سے کسی نے مقرر کر دیا ہو؟

یہ سوالات ہمیشہ ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں جس نے کبھی دنیا اور انسان کے متعلق کچھ غور کیا ہے۔ فلسفی، سائنس دان، مؤرخ، مقنن، سماج اور اخلاق اور مذہب کے مسائل سے بحث کرنے والے اور عام لوگ سبھی کو اس گتھی سے اپنا دماغ لڑانا پڑا ہے کیونکہ ہر ایک کی گاڑی یہاں آ کر اٹک جاتی ہے اور آگے نہیں چلتی جب تک کہ اس کا کوئی نہ کوئی قابل اطمینان حل نہ مل جائے۔

محض ایک سادہ سی ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں آپ ان سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دے لیجیے، ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کا دل مطمئن ہو جائے، مگر خواہ آپ ''ہاں'' کہیں یا ''نہیں'' دونوں صورتوں میں بے شمار دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا جواب دینا آپ کے ہاں اور نہیں دونوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ ''ہاں'' کہتے ہیں تو پھر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اختیار نہ اُن کو حاصل ہے نہ اس کو۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بناتا اور انسان کا ریلوے لائن بنانا دونوں میں چاہے درجہ کا فرق ہو مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں، کیونکہ ان سے چھتہ اور ریلوے لائن کوئی اور ہی بنوا رہا ہے۔ ایجاد کے شرف سے دونوں محروم ہیں۔ اس کے بعد آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک آدمی کا نیک کام کرنا اور ایک موٹر کا درست چلنا، دونوں یکساں ہیں۔ کسی آدمی کا جرم یا شرارت کرنا اور کسی سینے والی مشین کا خراب بخیہ کرنا دونوں کی ایک حیثیت ہے اور جب معاملہ یہ ہے تو جس طرح آپ ''نیک موٹر''، ''شریر مشین''، ''ایماندار انجن''، ''بدمعاش چرخہ'' نہیں بولتے، اسی طرح آپ کو آدمی کے لیے بھی نیک اور بد، شریر اور شریف، ایمان دار اور بے ایمان اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ نہیں بولنے چاہییں۔ یا اگر آپ بولتے ہی ہیں (کیونکہ جو کچھ آپ سے بلوایا جا رہا ہے، وہ بولنے پر آپ مجبور ہیں) تو کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ یہ الفاظ ہیں بے معنی۔

پھر بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا مذہب اور اخلاق، یہ ہمارا قانون اور عدالتوں کا نظام، یہ ہماری پولیس اور جیل اور تفتیش جرائم کے محکمے، یہ ہمارے مدرسے اور تربیت گاہیں اور اصلاحی ادارے سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ کام یہ سب ہوتے رہیں گے، بند ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق ان سب ایکٹروں کو دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا مقررہ پارٹ ادا کرنا ہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جب مسجدوں کے نمازی اور مندروں کے پجاری، عدالتوں کے جج اور چوری اور ڈکیتی کے مجرم سب کے سب محض ایکٹر بن کر رہ جائیں اور عبادت گاہوں سے لے کر جوئے خانوں اور قید خانوں تک سب کے سب ایک بڑے ناٹک کے مختلف منظر قرار پائیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی پوری مذہبی اور اخلاقی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا ہے۔ وہ شخص جورات کی تنہائی

میں خلوص سے پوجا اور عبادت کر رہا ہے اور وہ جو کسی کے گھر میں نقب لگا رہا ہے، دونوں اس تماشے میں بس وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ان کے درمیان کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ ڈائریکٹر نے ایک کو عابد و زاہد کا پارٹ دیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔ ہماری عدالت میں جج صاحب خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ مقدمہ کی سماعت فرما رہے ہوں اور اپنی دانست میں مقدمہ کو سمجھ کر انصاف کرنے کی کیسی ہی کوشش کر رہے ہوں مگر آپ کے اس نظریہ کی رو سے وہ اور مستغیث اور ملزم سب نرے ایکٹر ہیں اور بچارے اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ کر رہے ہیں ڈراما اور سمجھ رہے ہیں کہ عدالت کے کمرے میں واقعی عدالت ہو رہی ہے۔ یہ انجام ہے اس ''ہاں'' کا جو آپ نے سرسری طور پر میرے ابتدائی سوالات کے جوابات میں کر دی تھی۔

اچھا تو کیا پھر ان سوالات کا جواب ''نہیں'' کی صورت میں دیں گے؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی معاملہ ایک ''نہیں'' پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھ آپ کو بہت سی صریح حقیقتوں کا انکار کرنا ہوگا۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر پہلے سے مقرر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی تقدیر کسی بیرونی قوت کے فیصلہ سے نہیں بنتی تو غالباً آپ کے اس انکار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ مقرر کرتا ہے یعنی اس کی تقدیر اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس بیان میں لفظ ''انسان'' سے کیا مراد ہے؟ فرداً فرداً ایک آدمی؟ یا انسانوں کا ایک بڑا گروہ جسے سماج یا سوسائٹی یا قوم کہا جاتا ہے؟ یا پوری نوع انسانی؟ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے تو ذرا ان چیزوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جن سے تقدیر بنتی ہے پھر فرمایئے کہ آدمی ان میں سے کس پر قابو رکھتا ہے۔ تقدیر بنانے کا پہلا سامان آدمی کے اعضاء اور اس کی ذہنی اور جسمانی قوتیں اور اس کے اخلاقی اوصاف ہیں۔ جن کی درستی اور خرابی، توازن اور عدم توازن، کمی اور بیشی کا فیصلہ کن اثر اس تقدیر پر پڑتا ہے مگر یہ ساری چیزیں ہر انسان ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے اور آج تک کوئی ایک آدمی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جو خود اپنی تجویز اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے آپ کو بنا کر لایا ہو۔

پھر آدمی کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے میں ان بہت سے اثرات کا دخل ہوتا ہے جو ہر انسان کو وراثت میں اپنے آباؤ اجداد سے ملتے ہیں پھر جس خاندان، جس سوسائٹی، جس طبقے، جس قوم اور جس ملک میں وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی ذہنی، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالت کے بے شمار اثرات دنیا میں قدم رکھتے ہی اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں آدمی کی تقدیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں مگر کیا کوئی شخص ایسا ہے جس نے اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے اس نسل اور اس ماحول کا تعین کیا ہے جس میں اسے پیدا ہونا ہے اور خود یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ ان میں سے کس کس کے کیا اثرات قبول کرے؟ اسی طرح آدمی کی تقدیر پر دنیا کے بہت سے واقعات اور اتفاقات کے بھی اچھے اور برے اثرات پڑتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب، قحط، موسم، بیماریاں، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ اور اتفاقی حادثے اکثر انسان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس

نے بڑے سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے اپنی راحت اور اپنی کامیابی کے لیے بنائے ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بارہا یہی اتفاقات اچانک ایک انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ ایسی نمایاں حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنے کے لیے ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔ آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے؟

اب اگر آپ اپنے دعوے میں ترمیم کر کے یہ کہتے ہیں کہ افراد نہیں بلکہ قومیں اپنی تقدیر بناتی ہیں تو یہ بھی ماننے کے قابل بات نہیں۔ ہر قوم کی تقدیر جن اسباب سے بنتی ہے، ان میں نسلی خصوصیات، تاریخی اثرات، جغرافیائی حالات، قدرتی مسائل اور بین الاقوامی صورت حال کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات دنیا کی کسی قوم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ پھر وہ قانونِ قدرت جس کے تحت زمین و آسمان کا انتظام ہو رہا ہے اور جس میں دخل دینا تو درکنار، اسے پوری طرح جان لینا بھی کسی قوم کے بس کا کام نہیں ہے، اس طرح قوموں کی تقدیر پر اثر ڈالتا ہے کہ اس کے روکنے یا اس سے بچنے کی طاقت کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ قانون پسِ پردہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کبھی اچانک اور کبھی بتدریج اس کے عمل سے ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں جو ابھرتی ہوئی قوموں کو گراتے اور گرتی ہوئی قوموں کو ابھار دیتے ہیں۔

خیر یہ تو وہ اسباب ہیں جو صریح طور پر انسانی دانست سے باہر ہیں مگر جو اسباب بظاہر انسان کی دسترس میں ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ بھی کچھ امید افزا نہیں ہے۔ ایک قوم کی تقدیر بننے کا بہت کچھ انحصار اس پر ہے کہ اسے مناسب رہنمائی (لیڈر شپ) میسر آئے اور اس کے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد میں وہ صفات اور وہ خصوصیات موجود ہوں جو اس رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہیں۔ ہم ایسی کوئی نظیر نہیں پاتے کہ کسی قوم نے ان دونوں چیزوں کے حاصل کرنے میں آزادی کے ساتھ خود اپنے ارادے اور انتخاب سے کام لیا ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم کے ابھرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو اچھی رہنمائی بھی میسر آتی ہے اور اس میں وہ خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس رہنمائی کی کامیابی کے لیے مطلوب ہیں اور وہی قوم جب گرنے لگتی ہے تو رہنمائی اور پیروی دونوں کی قابلیتیں اس سے اس طرح رخصت ہو جاتی ہیں کہ اس کا کوئی دردمند بھی خواہ انہیں واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کون سا قانون ہے جس تحت تاریخِ اقوام کے یہ نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں۔

پھر کیا قوموں کو چھوڑ کر آپ پوری نوع انسانی کے متعلق یہ حکم لگائیں گے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بناتی ہے؟ مگر یہ کہنا اور زیادہ مشکل ہے۔ نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی، ملکوں میں پھیلی ہوئی، بے شمار مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں رنگی ہوئی اور لاتعداد زبانیں بولنے والی نوع کے متعلق اگر کوئی شخص یہ فرض کرتا ہے کہ اس کا ایک مجموعی ارادہ ہے جس کے مطابق وہ سوچ سمجھ کر اپنی تقدیر متعین کرتی ہے تو حقیقت میں وہ ایک بڑی عجیب بات فرض کرتا ہے۔ کیا واقعی اس نوع نے اپنی رفتارِ ترقی کے لیے یہ ٹائم ٹیبل خود تجویز کیا تھا کہ فلاں دور تک یہ پتھر کے اوزاروں سے کام

لے لی، پھر لوہے اور آگ کو استعمال کرنا شروع کر دے گی۔ فلاں عہد تک انسانی اور حیوانی طاقت سے کام کرتی رہے گی، پھر مشین کی طاقت استعمال کرنے لگے گی؟ فلاں صدی تک کمپاس کے بغیر کشتیاں چلائے گی پھر اپنی سمت سفر متعین کرنے میں کمپاس سے کام لے گی؟ پھر کیا وہ نوع انسانی ہی ہے جس نے افریقہ، امریکہ، یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا کی مختلف قوموں یعنی خود اپنے مختلف حصوں کے لیے مختلف تقدیریں متعین کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے عجیب وغریب دعوے کرنے کا خیال بھی کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ کے لیے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے کیونکہ جب نہ ہر ہر فرد اپنی تقدیر کا مالک ہے، نہ افراد کا کوئی مجموعہ، نہ پوری نوع، تو یہ تقدیر کی ملکیت آخر کس ''انسان'' کے حصہ میں آئے گی؟

آپ نے دیکھا، وہ سوالات جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے، ان کا جواب نہ محض ''ہاں'' کی صورت میں دیا جا سکتا ہے اور نہ محض ''نہیں'' کی صورت میں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے جو زبردست ارادہ کائنات کے اس نظام کو چلا رہا ہے، اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی بلکہ کام کرنا تو کیا، جی بھی نہیں سکتی۔ ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جو پوری قوت کے ساتھ زمین و آسمان میں چل رہی ہے، کسی میں اتنا بل بوتا نہیں ہے کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔ ہمارے جتنے علوم، جتنے تجربات، جتنے مشاہدات ہیں، سب کے سب اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی اس سلطنت میں کسی کی خودمختاری کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آسمان کے بڑے بڑے کروں کو جس نظام کے بندش اپنے مقرر کردہ راستے سے بال برابر جنبش نہیں کرتے دیتی، زمین کو جس طاقت نے ایک ضابطہ کے مطابق گردش کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی اور گرمی و سردی پر جس حکومت کا مکمل اقتدار ہے، انسان کی پیدائش سے پہلے جس قوت نے وہ اسباب فراہم کیے ہیں جن سے اس زمین پر انسان کا موجود ہونا ممکن ہوا اور جس قوت کے اختیارات کا یہ حال ہے کہ اسباب زندگی کے توازن میں تھوڑا سا ردوبدل بھی کر دے تو ہماری نوع آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر سکتی ہے۔ اس کے ماتحت رہتے ہوئے انسان کے لیے ایسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔

مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ طاقت جو ہمیں اس دنیا میں لائی ہے، جس نے ہم میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم کچھ اختیار رکھتے ہیں، جس نے ہم میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ ہم نیک و بد میں امتیاز کرتے ہیں۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال میں فرق کرتے ہیں اور دنیا کے معاملات میں ایک طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور دوسرا طرز عمل ترک کرتے ہیں، اس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ محض مذاق کے طور پر کیا ہے۔ ہمیں اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ مذاق اور کھیل اور تمسخر کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت وہی ہے جو وجدانی

طور پر ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے یعنی فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں اوران اختیارات کے استعمال میں ہم مناسب حد تک آزاد بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے بلکہ دی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا تعین مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ آزادی ہے ضرور۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم میں ہمارے لیے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ ہمارے لیے یہاں اتنی ہی آزادی ہے جتنی آزادی کی اس اسکیم میں گنجائش ہے اور ہم اخلاقی حیثیت سے درحقیقت اسی قدر ذمہ دار ہیں جس قدر ہم کو آزادی بخشی گئی ہے۔ یہ دونوں امور کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور ہم پر اپنے افعال کی ذمہ داری کتنی ہے، ہمارے دائرہ علم سے باہر ہیں۔ ان کو وہی طاقت جان سکتی ہے جس نے اپنی اسکیم میں ہمارے لیے یہ مقام تجویز کیا ہے۔

یہ نظریہ ہے جو اس مسئلہ میں مذہب نے اختیار کیا ہے۔ مذہب ایک طرف قادرِ مطلق خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گرد و پیش کی ساری دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہوگی اور دوسرے راستہ پر چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائے گی۔ یہ بات صرف اسی صورت میں معقول ہوسکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں''۔[مسئله جبر و قدر، ص ۱۱۲ تا ۱۲۰]

۳۔ امام طحاویؒ اور مسئلہ تقدیر

امام طحاویؒ عقیدہ کے موضوع پر اپنی مایہ ناز کتاب **العقیدة الطحاویة** میں عقیدۂ تقدیر کے بارے میں اہل سنت کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ نے اپنے علم سے مخلوق کو پیدا کیا، ان کی تقدیریں لکھیں اور ان کے لیے موت کا وقت مقرر کیا ہے۔ مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی اس سے کوئی چیز مخفی نہ تھی اور اسے ان کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے عملوں کے بارے میں علم تھا۔ اس نے اپنی مخلوق کو اپنی اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی سے منع کیا ہے۔

ہر چیز اس کے اندازے اور مشیت کے مطابق جاری وساری ہے۔ بندوں کی مشیت کے مقابلہ میں اسی (اللہ) کی مشیت نافذ ہے، سوائے اس کے کہ بندوں کے لیے جو وہ چاہے (اتنا اختیار انہیں دے دیتا ہے) پس جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ کی مشیت وارادہ نہ ہو وہ نہیں ہوتا۔

جسے اللہ چاہے اپنے فضل سے ہدایت دے، (گناہوں سے) بچائے اور عافیت بخشے اور جسے وہ اپنے عدل

سے چاہے گمراہ کرے، ذلیل کرے اور آزمائش میں مبتلا کرے۔ تمام لوگ اس کی مشیئت میں اس کے فضل اور عدل کے مابین پھرتے ہیں۔

وہ اس سے بلند و بالا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک اور مد مقابل ہو۔ اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا، اس کے فیصلے سے کوئی سر مو انحراف نہیں کر سکتا اور اس کے اَمر پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

ہم ان تمام باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

اللہ کو اَزل ہی سے قطعی طور پر معلوم تھا کہ اس کی جنت میں کتنے لوگ داخل ہوں گے اور آگ میں کتنے لوگ جائیں گے پس اس تعداد میں نہ کمی ہوگی اور نہ بیشی۔

اسی طرح اسے یہ بھی علم ہے کہ بندے کیا عمل کریں گے اور ہر ایک کو اس عمل کی طرف توفیق دی گئی جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا اور جن عملوں پر خاتمہ ہوگا، اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔ خوش بخت وہ ہے جس کے بارے میں اللہ نے لکھ دیا کہ یہ خوش بخت ہے اور بد بخت وہ ہے جس کی بدبختی اللہ کے ہاں لکھی جا چکی۔

مسئلہ تقدیر دراصل اللہ کی مخلوق میں اللہ کا ایک راز ہے جسے نہ کوئی اللہ کا مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ کوئی نبی و رسول۔ اس مسئلہ میں زیادہ غور وخوض ذلت و رسوائی اور سرکشی کا باعث و سبب بنتا ہے۔ اس مسئلہ میں غور و فکر کرنے یا وسوسے پیدا ہونے دینے سے بھی بچنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم اپنی مخلوق سے چھپا رکھا ہے اور مخلوق کو اس کے درپے ہونے (پیچھے لگنے/غور وخوض کرنے) سے منع کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ [سورة الانبياء،۲۳]

''وہ (اللہ) اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں''

جس نے (اللہ کے کسی کام کے بارے میں) یہ سوال کیا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو اس نے گویا اللہ کی کتاب کا حکم رد کر دیا اور جس نے اللہ کی کتاب کا کوئی حکم رد کر دیا تو ظاہر ہے وہ کافر ہو گیا۔

یہ خلاصہ ہے اس بحث کا کہ اللہ کے دوستوں میں سے ہر وہ جس کا دل منور ہے، وہ اس (نتیجۂ بحث) کا محتاج ہے اور جو علم میں راسخ ہیں ان کا (علمی) مقام بھی اس مسئلہ میں یہی ہے (جو بیان کر دیا گیا ہے یعنی ان کی رائے بھی یہی ہے)۔ کیونکہ علم دو طرح کا ہوتا ہے: ایک وہ (علم شریعت) جو مخلوق کی پہنچ میں ہے اور ایک وہ جو مخلوق میں سے کسی کی پہنچ میں نہیں ہے۔ لہٰذا جس طرح علم شریعت کا انکار کفر ہے، اسی طرح تقدیر کے بارے میں یہ دعویٰ کہ سب کچھ کسی انسان کو معلوم ہے، یہ بھی کفر ہے۔ ایمان اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ علم شریعت کے بارے سر تسلیم خم نہ کیا جائے اور تقدیر کے بارے بحث و جدل سے اعراض نہ کیا جائے۔

اور ہم لوح محفوظ اور قلم کے بارے میں بھی ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام چیزوں پر بھی جو لوح محفوظ میں لکھی جا

چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے بارے میں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ ہو کر رہے گی تو پھر ساری مخلوق بھی اگر جمع ہو کر اسے روکنا چاہے تو روک نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کے بارے میں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوگی تو پھر ساری مخلوق بھی اگر جمع ہو کر اسے کرنا چاہے تو وہ کر نہیں سکتی۔ ایک انسان سے جو چیز دور کر دی گئی ہے وہ اسے پا نہیں سکتا اور جو اس کے مقدر میں ہے وہ اس سے دور نہیں جا سکتی۔

بندے کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی پیدا کردہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب پہلے سے اللہ کے علم میں ہے کیونکہ اس نے اس کے لیے پہلے سے پکا اندازہ کر رکھا ہے۔ اس لیے ارض وسما میں اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس میں کسی طرح کی بھی کوئی رکاوٹ، تبدیلی اور کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ یہی ایمان کی گرہ، معرفت کی بنیاد اور اللہ کی توحید و ربوبیت کا صحیح اعتراف ہے جیسا کہ اللہ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں فرمایا:

(۱)...... ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴾ [سورة الفرقان: ۲]

''ہر چیز کو اس نے پیدا کر کے ایک مناسب اندازہ مقرر کر دیا ہے''۔

(۲)...... ﴿ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴾ [سورة الاحزاب: ۳۸]

''اور اللہ تعالیٰ کے (سب) کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں''۔

اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو تقدیر کے مسئلہ میں اللہ کے ساتھ جھگڑا شروع کر دے اور اس میں غور وفکر کر کے قلب سلیم کو پریشان کر ڈالے۔ ایسے شخص نے گویا اس مسئلہ میں غور وفکر کر کے اپنے آپ کو اس وہم میں ڈالا کہ اس نے ایک مخفی راز کو جاننے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اس میں پڑ کر اس نے اپنے آپ کو گنہگار بنا لیا ہے''۔ [العقيدة الطحاوية شرح وتعليق للشيخ ناصر الدين الالبانیؒ، ص ۲۱، ۳۱]

۴۔ امام ابن تیمیہؒ اور مسئلہ تقدیر

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی تصنیفات میں عقیدۂ تقدیر کے حوالے سے ہر پہلو سے بات کی ہے اور اہل سنت کے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کے کافی وشافی جواب دیئے ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کی چند تحریریں پیش خدمت ہیں۔

العقیدۃ الواسطیۃ میں آپ نے مسئلہ تقدیر کے چار درجات ذکر کیے ہیں:

۱۔ پہلا درجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے حوالے سے ان کی اطاعت، نافرمانی، موت اور رزق ہر چیز کے بارے میں علم ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ یہ کہ اللہ نے مخلوقات کی تقدیر کے بارے میں اپنا یہ علم لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔

۳۔ تیسرا درجہ یہ کہ ہر چیز اللہ کی مشیئتِ عامہ کے تابع ہے، کوئی چیز اس کے ارادے وقدرت سے باہر نہیں۔
۴۔ چوتھا درجہ یہ کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے، کوئی چیز اس کی تخلیق سے باہر نہیں۔ [العقیدۃ الواسطیۃ، ملخصاً]

امام ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ میں مسئلہ تقدیر کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''تقدیر کے مسئلے میں اہل سنت والجماعت کا موقف وہ ہے جس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں، مہاجرین وانصار میں سے السابقون الاولون کی بھی وہی رائے تھی اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی، ان کا بھی وہی موقف تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و مالک ہے خواہ وہ موجودات بذات خود ہوں یا ان کی صفات ہوں، بندوں کے افعال ہوں یا افعال کے علاوہ کچھ اور۔

اور جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔ پس سب کچھ اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو چیز وہ چاہے وہ اس کی قدرت سے باہر نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اگر وہ ایک چیز کو چاہتا نہیں تو اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ وہ اس پر قادر بھی نہیں۔

کائنات میں جو کچھ ہوا یا ہوگا، سب اس کے علم میں ہے۔ اور جو کچھ نہیں ہوا، اگر وہ ہوتا تو اسے معلوم ہے کہ وہ کیسے ہونا تھا۔ اس میں بندوں کے افعال اور غیر افعال سب شامل ہیں۔ اور اللہ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی ان کی تقدیریں لکھ دی ہیں۔ ان کی عمر، رزق، اور عمل وغیرہ سب کچھ لکھ دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ سعادت کی راہ اختیار کریں گے یا بدبختی اور شقاوت کی۔

اہل سنت اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی مشیئت کے تحت ہے اور اسے چیزوں کے وجود سے پہلے ہی ان کا علم ہوتا ہے، اس کے پاس ان کی تقدیریں ہیں اور یہ سب ان کے وجود سے پہلے ہی سے اس نے لکھ رکھا ہے''۔ [مجموع الفتاویٰ، ج۸ ص۴۴۹]

امام ابن تیمیہؒ مزید فرماتے ہیں:

''امت کے سلف صالحین اور ان کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بندے اس چیز کے مامور ہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں اور اس چیز سے رکنے کے پابند ہیں جن سے اللہ انہیں منع کرتے ہیں۔ اور وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ جو وعدہ اور وعید اللہ نے قرآن وسنت کے ذریعے کیا ہے، اس پر ایمان لانا چاہیے۔ اور سلف کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ جو کام فرض ہے اسے چھوڑنے کے لیے یا جو حرام ہے اس کے ارتکاب کے لیے کوئی شخص اللہ پر (تقدیر کی بنیاد پر) حجت بازی نہیں کرسکتا (کہ وہ کہے کہ اللہ نے چونکہ پہلے ہی ایسا لکھ دیا تھا اس لیے میں نے ایسا کیا ہے) بلکہ یہ اللہ کی حجتِ بالغہ ہے، اپنے بندوں پر''۔ [ایضاً، ج۸، ص۴۵۲]

امام ابن تیمیہؒ مزید فرماتے ہیں:

''امت کے سلف صالحین اوران کے علماء کا قضاوقدر پرایمان لانے کے بعد اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے وہ نہیں ہوتا اور یہ کہ اللہ جسے چاہے گمراہی پر ڈالے اور جسے چاہے ہدایت بخشے۔ اور یہ کہ بندوں کو بھی مشیئت اور قدرت دی گئی ہے۔ اسی قدرت اور مشیئت کی بنیاد پر وہ ان افعال کو انجام دیتے ہیں جو ان کے مقدر میں اللہ نے لکھ رکھے ہیں اور یہاں سلف یہ بھی کہتے ہیں کہ بندوں کی مشیئت کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ کی مشیئت بھی ہو''۔ (یعنی بندوں کی مشیئت اللہ کی مشیئت کے تابع ہے)۔[ایضاً، ج۸، ص۴۵۹]

ابن تیمیہؒ اور مسئلہ جبر وقدر

آئندہ سطور میں آنے والی بحث مولانا محمد حنیف ندویؒ کی کتاب ''عقلیاتِ ابن تیمیہ'' (ص ۲۷۸ تا ۲۹۶) سے لی گئی ہے۔ ہم نے اختصار کے پیش نظر کئی جگہ پر تکرار اور غیر متعلقہ عبارتوں کو حذف کر دیا ہے۔ مولانا ندویؒ نے امام ابن تیمیہؒ کی تصنیفات کی روشنی میں جبر وقدر (تقدیر) کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے اور مسئلہ کی تفہیم وتوضیح کی خاطر سیاق وسباق خود قائم کیے ہیں۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''صفات کی رعایت سے مسئلۂ جبر وقدر میں چار مدارسِ فکر رواج پذیر ہوئے:

۱)...... قدریہ نے تو یہ کہا کہ انسان آپ اپنے اعمال کا نقشہ تیار کرتا ہے۔ پھر ان کی تکمیل کے لیے آپ ہی ارادہ کارفرمائیوں کی طرف رجوع ہوتا ہے اور بالآخر اپنی ہی قدرت واستطاعت کے بل پر ان اعمال کی تخلیق کرتا ہے جن کی انجام دہی مقصود ہوتی ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی اعمال کی تفصیلات تیار نہیں کرتا۔ نہ اس کا ارادۂ ازلی ان اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نہ اس کی قدرت ان اعمال کی تخلیقِ وجود میں کوئی حصہ لیتی ہے اور نہ اس کی ذات پہلے سے ان اعمال کا علم ہی رکھتی ہے بلکہ اس کا علم اس وقت حرکت میں آتا ہے جب یہ اعمال وقوع پذیر ہو چکتے ہیں۔

۲)...... جبریہ کا موقف ان کے مقابلہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَزل سے انسانی اعمال کا نقشہ ترتیب دے رکھا ہے اور وہی انسانی ہاتھوں سے ان اعمال کی تخلیق وایجاد کا ذمہ دار ہے۔ انسانی استطاعت وقدرت اس کی قدرت واستطاعت کے سامنے محض بے بس اور بے چارہ ہے۔

۳)...... معتزلہ کو اگرچہ قدریت سے متہم کیا جاتا ہے، تاہم ان دونوں کے بین بین ان کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے جملہ اَعمال کا نقشہ اَزل سے بلاشبہ تیار کر رکھا ہے لیکن وہ صرف انہی اَعمال کو اس نقشہ کے مطابق انجام دیتا ہے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے ہے کیونکہ وہ سب کے سب خیر پر مشتمل ہیں اور ان میں

شر وضرر کا کوئی پہلو پایا نہیں جاتا۔ رہے انسانی اعمال جن میں خیر وشر کے دوگونہ عناصر پائے جاتے ہیں تو وہ نہ تو ان کی تخلیق کرتا ہے اور نہ ان کی تخلیق میں حائل ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی ذاتِ گرامی نے انسان کو قدرت واستطاعت کی پوری پوری آزادی دے رکھی ہے کہ اپنی صوابدید کے تحت جو چاہے کرے اور جو نہ چاہے اس سے دست کش رہے۔

۴)...... اَشاعرہ نے اِعتزال وجبر کے مابین ایک تیسری راہ نکالی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اَعمال کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ محض 'اِکتساب' کرتا ہے اور اس اِکتساب کی بنا پر یہ عنداللہ جواب دہ بھی ہے۔

قدریہ کی ذہنی مجبوری

قدریہ کی ذہنی مجبوری واضح ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اشکال کی نوعیت دو نکتوں میں منحصر ہے۔ استطاعت وقدرت اور علم وادراک کی تحدید۔ یعنی ان کے سامنے صورت مسئلہ یہ ہے کہ اگر بندوں کی قدرت واستطاعت کو مستقل بالذات اور غیر متاثر نہ مانا جائے، تو تکلیف یا اخلاقی ودینی ذمہ داری کے لیے کوئی وجۂ جواز پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے علم کو اس درجہ وسیع، حاوی اور جزئیاتِ اَعمال تک پھیلا ہوا تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ پہلے سے انسانی عزائم اور انسانی کارگزاریوں کا ایک نقشہ معلوم ومتعین ہے لہٰذا اس کے خلاف انسانی ارادہ کی تازہ کاریوں کے تمام امکانات بظاہر ختم ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے تکلیف یا اخلاقی ودینی ذمہ داریوں کو اتنا اہم قرار دیا جس سے اللہ تعالیٰ کے قدرت وعلم کے دائروں میں سمٹاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تاہم اس کے وصفِ عدل کو گزند نہیں پہنچتا۔

جبریہ اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کی وسعت وہمہ گیری سے اتنا متاثر ہوئے کہ اس کے لیے ان کو انسانی قدرت وارادہ کے دائروں کی کلیۃً نفی کرنا پڑی۔ اسی طرح گو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کی وسعتوں کو محدود اور سمٹا ہوا ہونے سے بچا لیا مگر اس کے وصفِ عدل کی کوئی معقول توجیہ پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اور یہ عقدۂ دشوار تر حل نہ کر پائے کہ اگر انسان اپنے عمل وارادہ کے لحاظ سے مجبور ہے تو پھر تکلیف، جزا وسزا اور محاسبہ کے لیے کس عقلی اساس کی تعیین کی جائے گی۔ قدریہ اور جبریہ کے موقف سے یہ چیز بہر حال عیاں ہے کہ دونوں نے انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں نے اس سلسلہ میں کن صفات کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔

معتزلہ کا اشکال یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے وصفِ علم وقدرت اور عدل وتوحید کی معقول توجیہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف یہ چاہتے ہیں کہ انسان کی فکری وعملی تگ وتاز پر کسی طرح کی قدغن عائد نہ کی جائے۔ یہ انسان کو صرف مختار ہی نہیں مانتے بلکہ اپنے اَعمال واَفعال کا خالق بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک انسان کی عملی ذمہ داریوں کا تعلق ہے، اَشاعرہ کا اختلاف بنیادی یا عقلی نہیں بلکہ محض تعبیر وتشریح کا

اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ [ابن تیمیہؒ] نے اَشعری کے کسب کے بارہ میں یہ مشہور قول نقل کیا ہے:

"ثلاثة اشياء لا حقيقة لها طفرة النظام، احوال ابی هاشم و كسب" صفات الكمال، ص ۱٤۹، مطبعة المنار، مصر۔

"یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ نظام کا طفرہ، ابن ہاشم کے احوال اور اشعری کا نظریہ کسب"۔

ان کے نقطۂ نظر سے ہر ہر انسان اگرچہ اپنے اعمال کے لیے عنداللہ جوابدہ ہے مگر اس جواب دہی کی بنیاد تخلیقِ اعمال نہیں بلکہ اکتسابِ اعمال ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ

علامہ ابن تیمیہؒ نے مسئلہ جبر و اضطرار کی پوری پوری چھان بین کی ہے اور ان تمام دلائل سے تعرض کیا ہے جو اس سلسلہ میں عموماً پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام کھلے بندوں انسانی اختیار کا قائل ہے اور عقلاً جبر کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ منجملہ ان مسائل کے ہے جن کو الحاد و زنادقہ کی بدعت طرازیوں نے جنم دیا ہے۔ (فرماتے ہیں:)

"سو تکلیف مالا یطاق کو علی الاطلاق پیش کرنا اسی طرح اسلام میں بدعت طرازی کے مترادف ہے جس طرح انسان کے بارہ میں علی الاطلاق یہ کہنا کہ وہ اپنے اعمال میں مجبور و مضطر ہے۔ سلف اور ائمہ سب نے بالاتفاق اس کا انکار کیا ہے"۔ [موافقة صحيح المنقول، لابن تيميه، ج ۱، ص ۳۵]

علامہ ابن تیمیہؒ کی جبر سے متعلق تین تنقیحات

یہ اس مسئلہ کا تاریخی پہلو ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں تک امت کے سیدھے سادے اور عمومی ذہن کا تعلق ہے اور ان ائمہ کبار کا تعلق ہے جنہوں نے صحیح معنوں میں اسلامی روح کو سمجھا اور عامۃ الناس تک پہنچایا، وہ بالاتفاق اس بات کے قائل تھے کہ اسلام انسانی اختیار کا زبردست داعی ہے اور اس کے نظام فکر میں جبر و اضطرار ایسی بدعات کے لیے کوئی گنجائش پائی نہیں جاتی۔

مسئلہ کا اصل مزاج چونکہ عقلی ہے اس لیے خصوصیت سے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ علامہ نے اس بحث میں کس دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ نے تین اہم نکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

۱۔ لفظ جبر کا استعمال صرف مستحدث یا بدعت ہی نہیں بلکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا بھی ہے۔

۲۔ قدرتِ خالق اور قدرتِ مخلوق میں فرق و امتیاز کی نوعیت واضح ہے۔

۳۔ علمِ الٰہی جبر کو مستلزم نہیں!

جبر کی اصطلاح گمراہ کن ہے!

جبر کی علی الاطلاق نفی کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے انسان کے نظامِ فکر و شعور کو کچھ اس طرح غیر متاثر پیدا کیا ہے کہ اس میں عادات، ماحول اور جبلی رجحانات تک کی دخل اندازی بھی گوارا نہیں۔ اور اس کی تائید کے معنی یہ ہیں کہ ارادہ واختیار کی کوئی رمق اس میں موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں غلو پر مبنی ہیں۔ انسان بلا شبہ ایک خاص ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ خاص طرح کی ذہنی ساخت لے کر آتا ہے اور متعین مزاج رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان مجبوریوں کے پہلو بہ پہلو اس میں جدت وتخلیق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی ہیں۔ اس بنا پر بقول علامہ کے قدماء نے سرے سے اس اصطلاح ہی کو گمراہ کن قرار دیا ہے۔ چنانچہ بقیہ بن ولیدؒ نے جب زبیدیؒ اور اوزاعیؒ سے جبر کے بارے میں استصواب کیا تو زبیدیؒ کا جواب یہ تھا:

''اللہ تعالیٰ کی شان اور قدرت اس سے کہیں بلند تر ہے کہ انسان کو مجبور کر کے رکھ دے یا اس کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرے۔ ہاں وہ مرتبہ علمی میں قضاء وقدر کا ایک نقشہ ضرور ترتیب دیتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان کو پیدا ضرور کرتا ہے اور حسبِ پسند انہیں بعض جبلی خصائص سے بہرہ مند بھی کرتا ہے''۔

اوزاعیؒ نے کہا:

''میں کتاب وسنت میں جبر کا لفظ نہیں پاتا۔ اس لیے اس کے نفیاً یا اثباتاً استعمال سے ڈرتا ہوں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کتاب وسنت میں جو مذکور ہے، وہ قضاء وقدر، خلق وجبل کے الفاظ ہیں''۔ [موافقة صحيح المنقول، لابن تيميه، ج١، ص٣٦]

'جبل' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہاں ہر شخص کو پیدا کرتا ہے اور جسم وقالب کا ایک خاص سانچہ عطا کرتا ہے وہاں ہر ایک انسان کو کچھ جبلی رجحانات اور فطری خصائص یا مزاج سے بھی بہرہ مند کرتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں اشج عبد القیس کے بارہ میں ہے:

((ان فيك لخصلتين يحبهما الله: الحلم و الاناة، فقال ا خلقين تخلقت بهما ام خلقين جبلت عليهما؟ فقال بل خلقين جبلت عليهما)) [موافقة صحيح المنقول، ج١ ص٣٦]

''تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ایک حلم اور دوسرے صبر وثبات۔ اس نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا یہ ایسی دو خصلتیں ہیں جنہیں میں نے اختیار کیا ہے یا ایسی ہیں کہ جن کو میری جبلت میں سمو دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: بلکہ یہ ایسی دو خصلتیں ہیں جن کو تمہارے ضمیر میں رکھ دیا گیا ہے''۔

علامہ (ابن تیمیہؒ) کی غرض یہ ہے کہ 'جبر' کے معنوں میں حق وباطل کی دوگونہ آمیزش ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان مطلقاً مختار نہیں۔ اس میں ساخت مزاج، اور عادات وخصائل کی مجبوریاں بھی ہیں۔ اور باطل کا پہلو یہ ہے کہ ارادہ

وتعقل کی کارفرمائیاں اس لائق ہیں کہ عادات وخصائل کے جبر کو توڑ کے رکھ دیں اور اختیار کے حسین وجمیل سانچوں میں ڈھال دیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کوئی ایسی جامع اصطلاح استعمال کی جائے جس میں مسئلہ کے یہ دونوں رُخ واضح ہوں۔

غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ زبیدیؒ اور اوزاعیؒ نے بڑے کام کی بات کہی ہے۔ انسانی کردار وسیرت کی تشکیل کا مسئلہ اس پر موقوف نہیں کہ اس کو جبر واختیار کے دوٹوک خانوں میں تقسیم کردیا جائے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان شعور وادراک کے بل بوتے پر اس جبر کے خلاف نبرد آزما ہو جو اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہے اور اپنے اعمال، تگ ودو، اور خصائل کو اس طرح منظم کرے اور اس طرح اختیار ودانش کے حدود میں لائے کہ جس سے شخصیت وسیرت کے مضمراتِ ارتقاء نکھر کر سامنے آجائیں۔ ٹھیک اسی نہج سے اختیار ودانش کو جب تک جبر واضطرار کے سانچوں میں ڈھالا نہیں جائے گا، کوئی بھی مستحکم واستوار کردار معرضِ ظہور میں نہ آسکے گا۔

جبر واختیار میں نسبتِ تضاد نہیں، ایک اہم غلطی کی نشاندہی

متکلمینِ اسلام نے اس بحث میں اس اہم نکتہ کو ملحوظ نہیں رکھا کہ جبر واختیار میں نسبت تضاد نہیں۔ اصل اشکال یہ نہیں کہ انسان یا مختار ہے اور یا مجبور۔ بلکہ اصل اشکال یہ ہے کہ جبر کو کیونکر اختیار میں بدلا جائے اور اختیار پر کس طرح جبر کی چھاپ لگائی جائے۔

ان میں تضاد کا تصور دراصل اس نسبت تقابل سے ابھرتا ہے جو کائنات اور انسان میں وقوع پذیر ہے۔ بلاشبہ یہ عالمِ مادی اور یہ کارخانۂ ہست وبود تمام تر جبر کی استواریوں پر قائم ہے۔ یہی نہیں اس جبر پر تمام علوم وفنون کا دارومدار ہے اور اگر خدانخواستہ قوانینِ فطرت جبر واضطرار کے خطوط پر گام فرسا ہونا چھوڑ دیں تو نظامِ عالم میں ایک زلزلہ آجائے۔ اس صورت میں کوئی علم اور کوئی فن قطعی نہ رہے۔ نہ علم النجوم [فلکیات] پر اعتماد رہے۔ نہ سائنس کے تجربات ہی یقین افروزیوں سے بہرہ مند ہوسکیں۔ جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ عالمِ مادی کو قائم وباقی رکھنے کے لیے جبر واضطرار کا وجود ایک نعمت سے کم نہیں۔ لیکن انسان میں آکر مادیت میں ایک اور لطیف عنصر کا اضافہ ہوجاتا ہے جسے ہم ارادہ واختیار کی طرفہ طرازیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس عنصر کا کام یہ ہے کہ کائنات کو حیز جمود سے نکال کر حرکت سے روشناس کرے اور تخلیق وابداع کے نئے نئے نقشے ترتیب دے۔ تہذیب وتمدن کے حسین وجمیل مرقعے تیار کرے اور اَخلاق وسیرت کے اعلیٰ نمونوں میں اضافہ کرے۔

ظاہر ہے کہ ارادہ واختیار کا یہ جدید عنصر جبر سے بالکل ہی علیحدہ اور الگ تھلگ شے نہیں بلکہ اسی کا ایک تتمہ ہے اور اپنی تمام تر کارفرمائیوں میں اس کا محتاج ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھنے کی کوشش کریں کہ اختیار وارادہ کا ہیولیٰ جبر واضطرار ہی کے گوشت پوست سے بنا ہے۔ اس لیے کسی طرح بھی اس سے کلیۃً بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے

اختیار جب بھی پایا جائے گا اور جہاں بھی پایا جائے گا، وہاں کسی نہ کسی مقدار میں جبر کا ہونا ضروری ہے۔ گویا جبر واختیار میں اصل بحث جبر واختیار کی نہیں بلکہ حدود (Limitations) اور تناسب (Proportion) کی ہے۔

علامہ نے اَوزاعیؒ کے موقف کی پرزور تائید کی ہے کیونکہ یہ جب لفظ 'جبر' کے علی الاطلاق استعمال کو نفیاً یا اثباتاً غلط سمجھتے ہیں تو اسی لیے کہ ان کے نزدیک انسان کا کوئی عمل بھی جبر واختیار کے الگ الگ خانوں میں تقسیم پذیر نہیں بلکہ ہر ہر عمل اختیار کے پہلو بہ پہلو جبر کی کچھ استواریاں بھی لیے ہوئے ہے۔[موافقة صحيح المنقول، لابن تيميه، ج ۱، ص ۳۵]

مثلاً اگر ہم کسی سمت قدم بڑھاتے ہیں تو یہ خالصتاً ہمارے اختیار کی بات ہے، لیکن چلنے کی یہ صلاحیتیں کس نے بخشی ہیں؟ ہم بولتے ہیں تو یقیناً اس کے پیچھے ہمارا ارادہ کارفرما ہے لیکن حجرہ ولب کے درمیان جو تعلق نطق و گویائی پر منتج ہوتا ہے، وہ ہمارا پیدا کردہ نہیں۔ اسی طرح ہم اپنے ہاتھوں سے جب کوئی نقش بناتے ہیں اور قلم و رنگ کی مدد سے کسی تصویر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں تو تصویر کا یہ بنانا اور سنوارنا یکسر ہماری صلاحیتِ فن کا مرہونِ منت ہے۔ مگر ہاتھوں کو ہم نے پیدا نہیں کیا۔ ذوق کی تخلیق بھی ہماری نہیں اور اسی طرح ہاتھوں میں اور ارادہ میں جو یک جہتی ہے اس کو بھی ہم نے جنم نہیں دیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ خود ارادہ کی تخلیقی صلاحیتوں سے ہم شب و روز بے شمار فائدے اٹھاتے ہیں مگر یہ خلّاق وفعّال عنصر جس میکانکی ترکیب کا نتیجہ ہے، وہ ہمارا پیدا کردہ کب ہے؟

اس تفصیل کے معنی یہ ہیں کہ عمل اور فن و ہنر کی تمام تر معجزہ طرازیاں اس بنا پر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے کائنات کو قوانین نظام اور تعلیل وتسبب کی جابرانہ زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ جن میں کبھی خلل رونما نہیں ہوتا۔ ورنہ تنہا اختیار کا کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

جبر سے متعلق ایک سفسطہ اور اس کا جواب

جبر کی تائید میں جس سفسطہ سے عموماً زیادہ کام لیا جاتا ہے وہ قدرتِ مخلوق اور قدرتِ خالق میں فرق و امتیاز کے حدود کی عدمِ تعیین سے ابھرتا ہے۔ مثلاً جبریہ کے حق میں جس مایۂ ناز دلیل کو رازی نے بیان کیا ہے وہ کچھ اس طرح کے مقدمات سے ترتیب پذیر ہے کہ فرض کیجیے اللہ تعالیٰ ایک خاص شے کو حرکت دینا چاہتے ہیں اور اسی شے کو انسان چاہتا ہے کہ ساکن و رَاکد رہے۔ اس کش مکش کا منطقی طور پر ایک نتیجہ تو یہ نکل سکتا ہے کہ دونوں اپنے ارادوں میں ناکام رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محال ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں کامیاب رہیں۔ یہ بھی استحالہ سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ حرکت وسکون میں نسبت ضدین کی ہے۔ جن کا باہم جمع ہونا صحیح نہیں۔ تیسری صورت یہ باقی

رہ جاتی ہے کہ ان میں ایک کامیاب ہو اور ایک ناکام ہو۔ یہ اس بنا پر محال ہے کہ قدرتِ عبد اور قدرتِ معبود، اقتضاءِ وجود کے اعتبار سے برابر ہیں، لہٰذا دونوں میں کس کو ترجیح حاصل ہو، یہ سوال حل نہ ہو سکے گا۔[موافقة صحيح المنقول، ج ١،ص ٤٦]

ان استحالوں کو استدلال میں ابھار کر پیش کرنے سے جبریہ کی غرض یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں یہ پیچیدگیاں محض اس بنا پر پیدا ہوتی ہیں کہ ہم دونوں قدرتوں کو موثر مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بھی اور اس کے بندوں کی قدرت واستطاعت کو بھی۔ یعنی ایک طرف تو ہم اللہ تعالیٰ کے بارہ میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی قدرت کا دائرہ مقدورات کی ہر ہر نوعیت سے باہر نہیں اور دوسری طرف اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنے دائرہ اعمال میں آزادانہ اختیار رکھتا ہے اور نئے نئے مقدورات کی تخلیق پر قادر ہے۔ یہ کھلا ہوا تناقض ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو وسیع تر اور حاوی تر مانا جائے گا تو انسانی قدرت واستطاعت کی لازماً نفی کرنا پڑے گی اور اگر انسانی قدرت واستطاعت کے حلقوں کو پھیلانا مقصود ہے تاکہ اس کی تکلیف و ذمہ داری کی کوئی توجیہ بیان کی جا سکے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سمٹاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

اس دلیل میں کیا پیچ ہے؟ علامہ نے اس کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکیب مقدمات میں اتنے سارے استحالوں کو پیدا کرنے کا موجب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلال کو ماننے کے ساتھ ساتھ انسان کو بھی اختیار وارادہ کی صلاحیتوں سے بہرہ مند تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ تناقضِ ارادتین ہے۔[ایضاً، ص ٤٧]

یعنی خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے ارادہ میں نسبتِ تضاد ہے اور یہ کہ دونوں کا ہدف ایک ہی 'مقدور' ہے۔ جس پر زور آزمائی ہو رہی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ ارادوں میں تناقض وتضاد تو اس وقت ابھرتا جب دونوں کو رب مان لیا جاتا اور دونوں کے بارہ میں یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ ان کا 'مقدور' یا ہدفِ قدرت ایک ہی شے ہے۔ لیکن اگر عقیدہ کی نوعیت یہ ہو کہ خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو قدرت واستطاعت بخشی ہے۔ اپنے اَعمال واَفعال کا ذمہ دار قرار دیا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اپنے بندوں کی قدرت سے نہ متصادم ہے اور نہ متعرض۔ زیادہ سلجھے ہوئے انداز میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کے بندے جو کچھ چاہتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ کی مشیت کا اقتضاء ہے:

﴿ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ﴾ [سورۃ الدھر: ٣٠]

''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو خدا کو منظور ہو''۔

اسی نے اس 'خودکار' اور خود آگاہ مشین کو پیدا کیا ہے جسے ہم حضرت انسان کہتے ہیں۔ اور اسی کی حکمتِ بالغہ نے اس میں قدرت وارادہ کے ایسے کل پرزے رکھے ہیں کہ جن کے بل پر یہ اپنے بنانے والے کے منشاء کے عین

مطابق عمل وفعل کے بوقلموں نمونوں کو ڈھالتا رہتا ہے۔

اشکالِ قدرت کی وضاحت

قدرت واستطاعت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بحث ہمارے ہاں یہ پیدا ہوئی کہ یہ انسان میں کب ابھرتی ہے؟ کیا یہ عین اس وقت انسانی اعمال کے ہم قرین ہوتی ہے جب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور اس سے پہلے اس کا وجود نہیں ہوتا۔ یا اس کا فعل سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ یا صورت حال یہ ہے کہ یہ اگرچہ فعل سے پہلے موجود ہوتی ہے تاہم عین اس وقت حرکت میں آتی ہے جب انسان کو کچھ کرنا ہوتا ہے۔

علامہ نے اس کا دوٹوک جواب قرآن کی روشنی میں دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قدرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے کہ جس پر جواب دہی اور تکلیف شرعی کا دارومدار ہے۔ اس کا پہلے سے ہونا ضروری ہے جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [سورة آل عمران:۹۷]

''اور لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کی استطاعت رکھے وہ اس کا حج کرے''۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [سورة التغابن:۱٦]

''سو جہاں تک تم میں استطاعت ہو خدا سے ڈرو''۔

﴿ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [سورة الانعام:۱۵۲]

''ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق''۔

دوسری قسم وہ ہے جسے فعل وعمل کے ہم قرین ہونا چاہیے:

﴿ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [سورة هود:۲۰]

''یہ شدت کفر سے تمہاری بات نہیں سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے''۔

﴿ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴾ [سورة الكهف: ۱۰۰،۱۰۱]

''اور اس روز جہنم کو ہم کافروں کے سامنے لائیں گے جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے''۔

کیا علمِ شے وجودِ شے کو مستلزم ہے؟

تیسرا اہم نکتہ جس پر علامہ کی طبع طرفہ طراز نے روشنی ڈالی ہے، یہ ہے کہ علم الٰہی جبر کو مستلزم نہیں!

آغازِ بحث ہی میں ہم تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ جبریہ نے کیونکر علم الٰہی کی وسعت وہمہ گیری کو اپنے حق میں بطور دلیل استعمال کیا ہے اور یہ کہ اس دلیل کی علمی اور منطقی حیثیت کیا ہے۔ یہاں ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت

علامہ نے اشکال کی اس نوعیت کو کیونکر رفع کیا ہے اور اس ضمن میں فکر وتعمق کے کن جواہر پاروں کو دامنِ تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت علامہ کے تصورِ صفات سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ایک یہ کہ ان کے نقطۂ نظر سے صفات میں اصل شے اثبات ہے۔نفی یا تجرید نہیں۔دوسرے یہ کہ صفات کا اثبات علیٰ وجہ الکمال ہونا چاہیے۔یعنی ان کے اِطلاق وعموم کو بہرحال قائم رکھنا چاہیے۔ان دونکتوں کو سامنے رکھیے تو اس حقیقت کے سمجھ لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی کہ علامہ نفسِ مسئلہ کے حل کی خاطر علمِ الٰہی کی وسعتوں کو محدود کر دینے کے حق میں نہیں ہیں جیسا کہ قدریہ کے بعض انتہا پسند حضرات نے کیا ہے۔[موافقة صحيح المنقول، ج۲ ص ۱۷۹]

اسی طرح وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ آگسٹن (Augustine) کی طرح علم کی وسعت واطلاق پر اس درجہ زور دیں کہ اس کا اثر انسانی ذمہ داری پر پڑے۔اور وہ اختیار وارادہ کی رہنمائی سے یکسر بے نیاز ہو جائے کیونکہ ایسا کرنے سے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے مرتبۂ علمی کو تو تحدید کے نقص سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے مگر اس کا وصفِ عدل وانصاف اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔مزید برآں اس صورت میں تکلیفاتِ شرعیہ کے لیے بھی کوئی عقلی اَساس باقی نہیں رہتی۔

علامہ نے علم وعدل کے دوگونہ تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ علمِ الٰہی کے خلاف کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوتی تو اس سلسلہ میں ہم مندرجہ ذیل دو غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں:

۱۔ہم یہ تو مانتے ہیں کہ علمِ الٰہی کے خلاف کچھ ظاہر نہیں ہو پاتا مگر اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ خود اس علم کا ہدف وموضوع کون چیز ہے۔

۲۔ہم اس کو بغیر سوچے سمجھے کلیہ تسلیم کر لیتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں!

غرض یہ ہے کہ اگر ہمارے ذہن میں صورت مسئلہ یوں ہو کہ اللہ تعالیٰ ان تمام اعمال کو پہلے سے جانتا بوجھتا ہے جن کو ہم اختیار وارادہ کی روشنی میں انجام دینے والے ہیں اور یہ نہ ہو کہ گھوم پھر کر ہمیں بہرحال وہی کچھ کرنا ہے جو پہلے سے مقدر ومعلوم ہے تو اس صورت میں علم کی ہمہ گیری ووسعت کے باوجود جبر واضطرار کا اعتراض نہیں ابھرتا کیونکہ علم کا تعلق صرف اور مطلق اعمال سے نہیں بلکہ اعمال مقدرہ سے ہے اور اعمال مقدرہ میں اختیار پہلے سے شامل ہے:

"ان الله يعلم على ما هو عليه فيعلمه ممكنا مقدرا للعبد"

''اللہ تعالیٰ کا علم اپنے بندوں کے بارہ میں اس نوعیت کا ہے کہ یہ اعمال ان کے لیے ممکن ہیں اور یہ کہ ان پر ان کو اختیار اور قابو حاصل ہے''۔[موافقة صحيح المنقول، ج۱، ص ۳۵]

دوسرے لفظوں میں علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علم الٰہی کی حیثیت بیانیہ (Descriptive) ہے مکرہ (Determinative) یا جبر واضطرار پر مجبور کرنے والی نہیں!

دوسرے نکتے کی تشریح علامہ یوں فرماتے ہیں کہ علم الٰہی کے خلاف کچھ ہونا ممکن نہیں۔ یہ کلیہ نہیں کیونکہ اشیاء کی ایسی قسم بھی فرض کی جاسکتی ہے جو مقدر و معلوم تو ہوں مگر سطحِ وجود پر کبھی فائز نہ ہوں مثلاً مسلمانوں میں کے صلحاء کو جہنم میں ڈالنا، قیامت سے پہلے قیامت کا برپا ہونا یا پہاڑوں کا یواقیت وجواہر کی شکل اختیار کر لینا۔ یہ ایسے 'معدومات' ہیں جو علم کے دائرے میں تو باتفاقِ عقلاء داخل ہیں لیکن مرتبۂ ثبوت و وجود پر فائز نہیں۔

" وهذه المعدومات الممتنعات ليست شيئا باتفاق العقلاء مع ثبوتها فى العلم" [الحجج العقلية والنقلية فيما ينافى الاسلام من بدع الجهمية والصوفية، لابن تيمية، ص٦٩، مطبع المنار، مصر]

''یہ معدومات ممتنعہ باتفاق عقلاء شے موجود کے مفہوم میں داخل نہیں حالانکہ درجہ علمی میں ان کا پایا جانا مسلم ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ اگرچہ ان معدومات کے بارہ میں پوری طرح آگاہ ہے تاہم مجرد علم اس لائق نہیں ہے کہ ان کو امتناع کی تاریکیوں سے نکال کر وجود و تحقق کی روشنی میں لے آئے۔

معارضہ کی اس صورت میں علامہ دراصل اس حقیقت کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ جبر واضطرار کے مؤیدین جب علمِ الٰہی کو اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کرتے ہیں تو علم کے اس مخصوص و متعین پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا تعلق انسانی اختیار سے ہے۔ یعنی ان لوگوں کی غلطی اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جبر کو مطلق علم پر مبنی قرار دیتے ہیں حالانکہ مطلق علم سرے سے غیر مؤثر ہے۔

یہ تو تھا مسئلہ جبر وقدر کا عقلی پہلو۔ علامہ نے اس کے عملی پہلوؤں پر بھی پوری پوری روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی یہ طنز کس درجہ تیکھی اور لاجواب ہے کہ جبریہ اپنی روزمرہ زندگی میں معصیتوں اور گناہوں کا ارتکاب تو اس وجہ سے دھڑلے سے کرتے ہیں کہ قضاوقدر کی تصریحات کچھ اسی کی مقتضی ہیں مگر مصائب اور تکالیف کو بخندہ پیشانی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان کو ترتیب دینے اور نافذ کرنے میں اسی کے اشارۂ چشم وابرو کو دخل ہے کہ جس نے تکلیفاتِ شرعیہ کو ضروری ٹھہرایا۔

" يستند اليه فى الذنوب والمعائب ولا يطمئن اليه فى المصائب" (اقوم ما قيل فى المشيئة والحكمة والقضاء والقدر والتعليل، لابن تيمية، ص١٣٣۔ مطبعة المنار مصر)

یہ گروہ گناہوں اور برائیوں میں تو قضاوقدر سے احتجاج کرتا ہے مگر مصائب میں اطمینان حاصل نہیں کرتا''۔

علامہ کے نقطۂ نظر سے عقیدہ و عمل کا یہ تضاد اس وجہ سے زیادہ افسوس ناک ہے کہ مسئلہ قضاوقدر کا یہی پہلو تو ایسا تھا

کہ اختیار کیا جاتا اور کردار و سیرت کی تشکیل کے سلسلہ میں اس سے مدد لی جاتی۔ اس میں کیا کیا حکمتیں پنہاں ہیں، قرآن کی اس آیت کی روشنی میں اس پر غور کیجیے:

﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ﴾ [سورة الحديد: ٢٢، ٢٣]

''کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ کام خدا کو آسان ہے تا کہ جو چیز تم نہیں پا سکے ہو، اس کا غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو اور خدا کسی اترانے والے اور شیخی بگھارنے والے کو پسند نہیں کرتا''۔

یعنی اگر اس حقیقت کو مان لیا جائے کہ ہمیں جس جس تکلیف کا سامن کرنا پڑ رہا ہے، اس کا سامنا کرنا ہی تھا تو اس سے دل کو ایک طرح کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مال و دولت اور جاہ و حشمت کی فراوانیوں کے بارہ میں یہ سمجھ لے کہ یہ میری سعی و کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کے فضل و بخشش کی رہین منت ہیں تو اس سے کبر و نخوت کے جذبات نہیں ابھر پاتے۔

علامہ شرعیات و تکوینیات کے فرق کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں قضا و قدر کے بارے میں صحیح اور صحت مند موقف یہ ہے کہ جہاں تک گناہ و معصیت کا تعلق ہے اس کی ذمہ داریوں کو تو ہونا چاہیے کہ انسان خود قبول کرے اور اس کے لیے بخشش و عفو کا طالب ہو لیکن مصائب و آفات تکوینیہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ ان کا وقوع پذیر ہونا بہر حال پہلے سے مقدر اور ضروری تھا۔

" خير الخلق الذين يصبرون على المصائب و يستغفرون من المعائب" [اقوم ما قيل في المشيئة والحكمة، ايضاً، ص١٣٣]

''بہترین وہ لوگ ہیں جو مصائب پر صبر کرنے کے عادی ہیں اور معائب پر اللہ سے بخشش چاہتے ہیں''۔

[علامہ کا یہ] استدلال اس آیت سے ہے:

﴿ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ ﴾ [سورة المؤمن: ٥٥]

''تو صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو''۔

استدلال کس درجہ انوکھا، واضح اور صاف ہے، داد نہیں دی جا سکتی۔ قرآن کے مضامین پر عبور ہو تو ایسا ہو۔

......☆......

مصنف کی دیگر مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات
1	قیامت کی نشانیاں	424
2	پیش گوئیوں کی حقیقت (اور عصر حاضر میں ان کی تعبیر کا منہج)	352
3	عاملوں، جادوگروں اور جنات کا پوسٹمارٹم (مع روحانی علاج معالجہ)	472
4	جدید فقہی مسائل	424
5	اسلام میں تصور جہاد	480
6	جہاد اور دہشت گردی	428
7	هدية العروس ..... [ازدواجی وخانگی اَحکام ومسائل کا بیان]	600
8	هدية الوالدين ..... [اولاد اور والدین کے باہمی مسائل واحکام کا بیان]	296
9	هدية النساء ..... [خواتین کی دینی واخلاقی تربیت اور احکامِ نسواں کا بیان]	460
10	انسان اور نیکی [نیکیوں کے دنیوی اور اُخروی فوائد]	184
11	انسان اور گناہ [گناہوں کے اَخلاقی، روحانی، دنیوی اور اُخروی نقصانات]	448
12	اللہ اور انسان [عقیدۂ توحید اور ایمان باللہ کا بیان]	176
13	انسان اور رہبر انسانیت [عقیدۂ رسالت اور اتباع سنت کا بیان]	184
14	انسان اور قرآن [قرآن کے ساتھ ایمان وعمل کے تعلق کی مضبوطی کا بیان]	184
15	انسان اور فرشتے [فرشتوں پر ایمان اور انسانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کا بیان]	160
16	انسان اور شیطان [شیطان کی حقیقت اور اس کے مکروفریب سے بچاؤ کی تدابیر کا بیان]	192
17	انسان اور جادو، جنات [جادو، جنات اور نظر بد کے توڑ اور روحانی علاج معالجہ کا بیان]	224
18	انسان اور کالے پیلے علوم [عقائد کی خرابی کا باعث بننے والے علوم کا بیان]	232
19	انسان اور آخرت [موت، قبر، برزخ، قیامت، محشر اور جنت وجہنم کا بیان]	200
20	انسان اور قسمت [تقدیر (قضاوقدر) پر ایمان اور اس سے متعلقہ مسائل واَحکام کا بیان]	184
21	انسان اور کفر [نواقضِ ایمان اور ضوابطِ تکفیر کا بیان]	184
22	جہیز کی تباہ کاریاں	136
23	خوشگوار گھریلو زندگی	184
24	کیا موسیقی حرام نہیں؟ [مؤلف: ناصرالدین البانی"، مترجم: جمیل اختر، اضافہ: مبشر حسین]	184

سلسلہ اصلاحِ عقائد

عقائد و ایمانیات کے جملہ مباحث پہلی بار
ایک نئے اور عام فہم اُسلوب میں

1. اللہ اور انسان | عقیدۂ توحید کا بیان |
2. انسان اور رہبر انسانیت ﷺ | عقیدۂ رسالت اور اتباع سنت کا بیان |
3. انسان اور قرآن | قرآن مجید کے ساتھ ایمان و عمل کے تعلق کی مضبوطی کا بیان |
4. انسان اور فرشتے | فرشتوں پر ایمان اور انسانوں کے ساتھ ان کے عجیب وغریب تعلقات کا بیان |
5. انسان اور شیطان | شیطان کی حقیقت اور اس کے مکروفریب سے بچاؤ کی تدابیر کا بیان |
6. انسان اور جادو، جنات | جادو، جنات کا توڑ اور مسنون روحانی علاج معالجہ کا بیان |
7. انسان اور کالے پیلے علوم | عقائد کی خرابی کا ذریعہ بننے والے علوم کا بیان |
8. انسان اور آخرت | موت کے بعد پیش آنے والے جملہ اُخروی مراحل کا بیان |
9. انسان اور قسمت | قسمت و تقدیر اور محنت و کوشش کا بیان |
10. انسان اور کفر | نواقض ایمان اور ضوابطِ تکفیر کا بیان |

خصوصیات: عام فہم اور دلچسپ اسلوب، قرآن وسنت سے استدلال، فکر سلف کی ترجمانی، صحتِ دلائل اور صحتِ استدلال، گمراہانہ افکار وعقائد کا رد، شستہ انداز اور معتدل فکر، تعصب اور طنز و تشنیع سے پاک، مستند حوالہ جات کا اہتمام اور ناقابلِ حجت روایات سے اجتناب

خوبصورت اور معیاری طباعت، قیمت انتہائی مناسب

یہ کتابیں: دعوتی نقطۂ نظر سے بے حد مفید اور اُردو زبان پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے انتہائی قابلِ فہم ہیں۔ مطالعہ کیجیے، دوسروں تک پہنچایئے اور صدقہ جاریہ کا ذریعہ بنایئے!